سہ ماہی

# شعور و آگہی

لاہور

اکتوبر تا دسمبر 2009ء    شوال تا ذوالحج ۱۴۳۰ھ    جلد نمبر1  شمارہ نمبر 4-3  رجسٹرڈ نمبر S-370

www.rahimia.org

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

# قرآنی تعلیمات کا لازمی تقاضہ

’’حضرات اکابرین ...نے قرآنی علوم ومعارف کے پھیلاؤ کے لیے جو تحریکات بر پا کیں تھیں، ان کا مقصد قطعاً یہ نہ تھا کہ رسمی طور پر قرآنِ کریم کی تعلیم کا انتظام ہو جائے، اور بے روح ادارے محض ظاہری طور پر کھڑے کر دیئے جائیں بلکہ اس تمام ترسعی و کاوش کا بنیادی اساسی مقصد یہ تھا کہ دورِ غلامی اور زمانہ زوال میں قرآنی تعلیم کا لازمی تقاضہ یعنی ۔۔۔تحریک آزادی وحریت ۔۔۔ کے حوالے سے نوجوانوں کو بیدار کیا جائے ۔ ایک مسلمان جب قرآن پر اعتماد و یقین کا اظہار کرتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اغیار کی غلامی سے نجات حاصل کر کے پوری آزادی وحریت کے ساتھ اپنا نظام ، اپنے انسانیت دوست نظریہ کے مطابق تشکیل دے سکے۔ اور یہ وہی سوچ ہے جس کا اظہار حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کیا تھا، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

”یجب بذل الجهد على اهل الآراء الكلية فى اشاعة الحق و تمشيته و اخمال الباطل وصده فربما لم يمكن ذالک الا بمخاصمات او مقاتلات فيعد كل ذالک من افضل اعمال البر“. (حجۃ اللہ البالغہ، باب الرسوم السائرہ فی الناس، ص 104، عربی، طبع بیروت)

’’مفادِ عامہ کی سوچ رکھنے والوں پر یہ بات واجب ہے کہ وہ حق کے پھیلاؤ اور غلبہ کے لیے اور باطل کو مٹانے اور روکنے کے لیے جدوجہد اور کوشش کریں اور بسا اوقات یہ کام اُس وقت تک ممکن نہیں ہوتا، جب تک کہ فرسودہ نظام کو توڑنے کے لیے لڑائی اور مزاحمت (انقلاب) کا عمل اختیار نہ کیا جائے، ایسے زمانہ میں یہ کام کرنا نیکیوں کے تمام اعمال سے افضل ہوتا ہے‘‘۔

(قرآنِ حکیم کی تفسیر وتعبیر کا ایک جامع اسلوب اور اس کے ارتقاء اور تطور کا جائزہ)

www.rahimia.org

دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی تحقیقی مجلّہ

# سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

اکتوبر تا دسمبر 2009ء / شوال تا ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ | شمارہ نمبر 4,3: جلد نمبر 1 | رجسٹرڈ نمبر S-370

زیرِ سرپرستی
حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ

مجلس ادارت
صدر مجلس: پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن
مدیر اعلیٰ: مفتی عبدالخالق آزاد
مدیر: محمد عباس شاد

مشاورت
- مفتی عبدالمتین نعمانی — بورے والا
- پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل — سعودی عرب
- مفتی عبدالقدیر — چشتیاں
- پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالمقیت شاکر علیمی کراچی
- مفتی عبدالغنی قاسمی — لاہور
- پروفیسر حسین احمد علوی — چشتیاں
- مفتی محمد مختار حسن — نوشہرہ
- پروفیسر ڈاکٹر ابرار محی الدین — بہاولپور
- سید سیف الاسلام خالد — راولپنڈی
- پروفیسر محمد سعید اختر — اسلام آباد
- مولانا عبداللہ عابد سندھی — شکار پور
- پروفیسر تاج افسر — اسلام آباد
- مولانا محمد ناصر — جھنگ
- پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر — لاہور

قیمت فی شمارہ: 100 روپے | سالانہ زرِتعاون: 350 روپے

شعبہ مطبوعات
ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور
رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور
Ph:0092-42-36307714 / 36369089 , Web:www.rahimia.org

مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے علی فرید پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر دفتر سہ ماہی مجلّہ "شعور و آگہی" لاہور، رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ، لاہور سے شائع کیا۔

www.rahimia.org

# فہرست مضامین


آغازیہ: حرفِ اول ---------------------------- (3)

از مدیر اعلیٰ

مطالعۂ قرآنیات: قرآنِ حکیم کی تفسیر و تعبیر کا ایک جامع اسلوب اور اس کے ارتقاء اور تطور کا جائزہ ---------- (5)

از مفتی عبد الخالق آزاد ☆

مطالعۂ حدیث و فقہ: استحسان بالاثر کی اجتہادی حیثیت (ایک اطلاقی مطالعہ) ---------------- (59)

از پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن ☆

تعارف شخصیات: حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اجدادِ گرامی اور اخلافِ کرام (خانوادۂ ولی اللّٰہی کے بارے میں تاریخی و تحقیقی معلومات) --- (79)

از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی ☆

آراء و تأثرات: ------------------------------ (117)


# تعارف مقالہ نگار

☆ مفتی عبد الخالق آزاد

ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

☆ پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن

پروفیسر شعبہ علومِ اسلامیہ، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

☆ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

مدیر سہ ماہی ''احوال و آثار'' کاندھلہ، ضلع مظفر نگر (انڈیا)

www.rahimia.org

آغازیہ

# حرفِ اول

الحمدللہ! دینی شعور اور سماجی آگہی کے پھیلاؤ کے لیے مجلّہ ''شعور و آگہی'' کا اجراء، نظامِ ظلم وستم اور کفر وطغیان کے اس ماحول میں، جہاں ہر طرف گھٹاٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے ہیں، روشنی کا ایک بہترین آغاز ثابت ہوا، اور جب گزشتہ سہ ماہی میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو قارئین نے اس کو بہت پذیرائی بخشی۔ ہر سمت سے علماء، پروفیسرز اور دانشور حضرات نے اس کاوش کو خوب سراہا، اس سلسلے میں اب تک بہت سے حضرات کے خطوط اور پیغامات موصول ہو چکے ہیں، احباب نے گھٹن کے اس ماحول میں شعور و آگہی کی اس روشنی کے پھیلانے پر اپنی خوشی کے سچے جذبات کا اظہار کیا، نیز بہت سے دوستوں اور احباب نے مفید مشوروں سے نوازا۔ اس پر ہم ان تمام احباب کے مشکور ہیں، خاص طور پر وہ حضرات جنہوں نے ہمیں اپنے مفید مشوروں سے بجا طور پر بہرہ ور کیا۔

''شعور و آگہی'' کے اجراء پر 16 اگست 2009ء کو ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ، لاہور میں ایک تقریب رونمائی بھی منعقد ہوئی۔ جس میں حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ کی زیرِ صدارت ملک کے ممتاز دانشوروں اور علمائے کرام نے اس مجلّے کی اہمیت اور اس سے زیادہ سے زیادہ فوائد سمیٹنے کے حوالے سے رہنمائی فراہم کی اور اپنے عمدہ خیالات کا اظہار فرمایا، نیز مجلس ادارت کے ارکان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس تقریب میں بڑی کثرت سے تعلیم یافتہ نوجوان احباب نے شرکت کی۔ آخر میں شرکاء نے اس مجلّے کی ممبر شپ لینے کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور اکثر حضرات نے اس تقریب رونمائی کو یادگار بنانے کے لیے مجلّے کے پہلے شمارے پر حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ اور مجلس ادارت کے اراکین سے دستخط کروائے۔ یوں یہ یادگار تقریب تمامِ اراکین ادارہ کے لیے حوصلہ افزائی کا سبب بنی۔

اب یہ دوسرا شمارہ پیش خدمت ہے، اس شمارے میں ''مطالعۂ قرآنیات'' کے ذیل میں پہلا مقالہ ''قرآنِ حکیم کی تفسیر وتعبیر کا ایک جامع اسلوب اور اس کے ارتقاء اور تطور کا جائزہ'' کے عنوان سے ہے، بلا شبہ برصغیر پاک و ہند میں قرآن حکیم کے مطالعہ اور اس کی تفسیر وتعبیر کا ایک اہم اسلوب حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات میں ہمیں ملتا ہے، اس حوالہ سے ان کے اس تفسیری اسلوب کا اساسی فلسفہ، تفسیری اصول وضوابط اور اس کے بنیادی نکات کیا رہے ہیں، اس کا مطالعہ کرنا آج کے دور کی بنیادی ضرورت ہے، پھر نہ صرف اس جامع تفسیری اسلوب کو سمجھنا ضروری ہے، بلکہ اس کے تطور و ارتقاء کا سلسلہ کیسے آگے بڑھا، اسے جاننا بھی ضروری ہے، آج جب کہ مجددینِ اُمت

www.rahimia.org

کے مستند تاریخی تسلسل سے کٹ کر خود ساختہ خیالات و تصورات کو قرآن فہمی کی بنیاد بنایا جا رہا ہے، یا پھر روایتی اندازِ فکر کے ساتھ صرف عبادات اور انفرادی سطح پر مسائل دینیہ معلوم کرنے کی حد تک تفسیر قرآن کو محدود کیا جا رہا ہے، ایسے وقت میں ضروری ہے کہ مجددین اُمت کے تفسیری اسلوب پر مبنی اُس مستند سلسلے کے بارے میں آگہی حاصل کی جائے، جو ایک طرف قرآن فہمی کے حوالے سے تاریخی تسلسل کا حامل ہے تو دوسری طرف وہ دورِ جدید کے پیش آمدہ سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کے حل کی درست نشاندہی بھی کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر کا ایسا جامع اسلوب جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں عبادات، معاملات، سیاسیات، معاشیات، اور سماجیات تک کے تمام دائروں میں رہنمائی فراہم کرتا ہے، وہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے سچے متبعین کا ہے، خاص طور پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے تفسیری اُسلوب کی یہ خوبی ہے کہ وہ ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس مقالے میں اس تفسیری اُسلوب اور اس کے ارتقاء و تطور کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس شمارے کا دوسرا مقالہ ''مطالعۂ حدیث و فقہ'' کے ذیل میں ''استحسان بالاثر کی اجتہادی حیثیت، (ایک اطلاقی مطالعہ)'' کے عنوان سے ہے، اس مقالے میں فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن نے ایک اہم فقہی اصطلاح کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم، اس کے دائرۂ کار اور اس کے ذیل میں ہونے والی قانون سازی کے اہم اور بنیادی پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ احادیث کے مطالعے کا یہ فقہی انداز یقیناً بہت سی قانونی گتھیوں کو سلجھانے کا باعث بنے گا۔ فقہ اور قانون کے طالب علم اس مقالے کی اہم مباحث سے یقیناً خوب استفادہ کریں گے۔

اس شمارے کا تیسرا مقالہ ''تحقیقات'' کے ذیل میں ''حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ کے اجدادِ گرامی اور اخلافِ کرام'' کے عنوان سے ہے، جس میں فاضل مقالہ نگار مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے خانوادۂ ولی اللّٰہی کے بارے میں تحقیقی اور تاریخی معلومات پیش کی ہیں، امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، آپ کے اجدادِ گرامی اور آپ کے صاحبزادگان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں بہت سے نئے گوشے اس مقالے سے واضح ہوتے ہیں، یہ مقالہ اگرچہ ایک معاصر میں کافی عرصہ قبل طبع ہو چکا ہے، تصحیحات کے بعد فاضل مقالہ نگار نے یہ مقالہ ہمیں عنایت کیا تھا، ''شعور و آگہی'' میں تاریخی اور تحقیقی معلومات پر مبنی اس مقالے کی طباعت، ولی اللّٰہی خانوادہ کے فکر و عمل سے شعوری وابستگی رکھنے والے لوگوں کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث بنے گی۔

''آراء و تأثرات'' کے ذیل میں اس مجلّے کے پہلے شمارے سے متعلق چند حضرات کے تأثرات پر مبنی خطوط شامل اشاعت کیے جا رہے ہیں، تاکہ قارئین تک دوستوں کی آراء اور تجاویز بھی پہنچ سکیں۔

آخر میں تمام قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تجاویز اور آراء سے ہمیں ضرور مطلع فرمائیں۔ تاکہ اس مجلّے کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے میں آپ کی آراء سے مدد لی جا سکے۔

(مدیر اعلیٰ)

www.rahimia.org

مطالعۂ قرآنیات

# قرآنِ حکیم کی تفسیر و تعبیر کا ایک جامع اُسلوب

# اور اس کے ارتقاء اور تطور کا جائزہ

تحریر: مفتی عبدالخالق آزاد

قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت اور عمومی پھیلاؤ کے لیے برصغیر پاک و ہند میں جس تحریک کا آغاز حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا، وہ آپ کی نسبی اور روحانی اولاد کے ذریعہ سے بتدریج آگے بڑھتی رہی۔ حتّٰی کہ آپ کے بعد بھی آپ کے خانوادۂ نسبی و روحانی نے اسی اندازِ فکر و عمل پر کام کر کے انسانی قلوب میں قرآنی تعلیمات منتقل کرنے کی جدوجہد فرمائی۔

## شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اُسلوبِ تفسیر کا اساسی مقصد

قرآنِ حکیم کے حوالے سے آپ نے جس فکر و عمل کی بنیاد رکھی، اس کا اساسی مقصد دور کے تقاضوں کے مطابق ہر شخص کے دل و دماغ تک عام فہم انداز میں قرآنی علوم و معارف کا پہنچانا تھا۔ چنانچہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے ترجمہ قرآن حکیم ''فتح الرحمٰن'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

''نصیحت و نیک خواہی مسلمان در ہر زمان و در ہر مکان رنگے دیگر دارد، و اقتضائے دیگر مے نماید، ولہٰذا علمائے دین و کبرائے اہل یقین در تفسیر و احادیث و عقائد و فقہ و سلوک تصانیف متنوعہ ساختہ اند، و توالیف گونا گوں پرداختہ، طائفہ شاہراہِ اطناب اختیار نمودہ، و فرقہ کوچۂ اختصار پیش کردہ، جماعت بزبانِ عجم سخن گفتہ اند، و گروہے بلغتِ عرب در سفتہ، و دریں زمانہ کہ ما در آنیم، و دریں اقلیم کہ ما ساکنِ آنیم، نصیحتِ مسلماناں اقتضاء مے کنند کہ ترجمۂ قرآن بزبانِ فارسی سلیس روزمرہ متداول بے تکلف فضیلت نمائی و بے تصنع عبارت آرائی، بغیر تعرض قصص مناسبہ، و بغیر ایراد توجیہاتِ منشعبہ تحریر کردہ شود، تا خواص و عوام ہمہ یکساں فہم کنند، و صغار و کبار بیک وضع ادراک نمایند''۔(1)

ترجمہ: ''ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، ہر زمانہ اور ہر ایک علاقہ میں مسلمانوں کی خیر خواہی اور بھلائی کا کام ایک نیا رنگ لیے ہوتا ہے، اس لیے علمائے دین اور اہل یقین کے بڑے بڑے لوگ تفسیر، حدیث، عقائد، فقہ، سلوک، وغیرہ میں متنوع تصانیف لکھتے رہے ہیں، اور گونا گوں تالیفات مرتب کرتے

www.rahimia.org

رہے ہیں، ایک جماعت نے شرح وتفصیل کا راستہ اختیار کیا اور ایک جماعت نے اختصار کے ساتھ اپنی گفتگو کو پیش کیا، ایک جماعت نے عربی زبان میں تحریرات لکھیں اور دوسری جماعت نے دیگر عجمی زبانوں میں گفتگو تحریر کی، آج ہم جس زمانہ میں ہیں، اور جس ملک (برصغیر ہندوستان) میں ہم رہتے ہیں، مسلمانوں کی خیر خواہی کا تقاضہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کا ترجمہ سلیس فارسی زبان میں روزمرہ محاورہ کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جائے، جس کی عبارت ہر قسم کے تصنع اور بناوٹ اور بڑائی سے پاک ہو اور اس میں قصص و واقعات اور غیر ضروری توجیہات وتشریحات کی بجائے آیات کا ترجمہ پیش کیا جائے، تاکہ عوام وخواص یکساں طور پر اس کو سمجھیں، اور چھوٹے بڑے ایک ہی نہج پر اس کا شعور حاصل کریں"۔

## اس اُسلوبِ تفسیر کے بنیادی اُمور

اس اساسی مقصد کے حصول کے لیے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے چند بنیادی اُمور طے کئے، چنانچہ آپ نے ایک تو قرآن حکیم کے بنیادی فکر وفلسفہ کا تعین کیا، اور اس کے لیے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" تصنیف کی، دوسرے علومِ قرآنیہ کے ارتقاء کے ہزار سالہ دور کا تحلیل وتجزیہ کرتے ہوئے قرآن فہمی کے بنیادی اصولِ تفسیر کا تعین کیا، اور اس کے لیے "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ اور تیسرے یہ کہ متعین شدہ قرآنی فلسفہ اور مقرر کردہ اُصولِ تفسیر کی روشنی میں علمی انداز میں قرآن حکیم کا عام فہم فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ جس کا نام "فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن" رکھا۔ ان تین کاموں سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جامع تفسیری اسلوب کا بنیادی رُخ متعین ہوگیا۔

## (۱) قرآنی انقلاب کی بنیادی فلاسفی کا تعین اور اس کے بنیادی نکات:

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے قرآنی انقلاب کی گزشتہ تقریباً ہزار سالہ تاریخ کا تحلیل وتجزیہ کر کے سب سے پہلے قرآن کی حکمت اور اس کے اسرار ورموز کی جامع فلاسفی کا تعین فرمایا۔ اور اس حوالے سے سفر حج سے واپسی پر ۱۱۴۷ھ بمطابق 1734ء میں اپنی معرکۃ الآراء کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" سپردِ قلم فرمائی، اس میں آپ نے قرآنی انقلاب کے جملہ اساسی اصولوں اور اس کے عملی تقاضوں کا ایسا جامع خلاصہ بہترین ترتیب کے ساتھ بیان کیا، کہ جس سے دین اسلام کا مربوط نظامِ فکر وعمل اور اس کا اساسی جوہر نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

## دین وسیاست کی اہمیت

کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے مباحث اور مضامین کا تحلیل وتجزیہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب بنیادی طور پر دو قسموں پر مشتمل ہے: پہلی قسم میں اُن اساسی سات مباحث کا تعین کیا گیا ہے، جن میں بنیادی قواعد کلیہ کا بیان کیا گیا ہے، اور جو اُمورِ عامہ کے طور پر قرآن حکیم اور احادیث نبویہؐ کے اسرار ورموز سمجھنے کے لیے ضروری ہیں، اور اس

www.rahimia.org

سوال کا جائزہ لیا گیا ہے کہ انسان کو شرائع الٰہیہ کا مکلّف کیوں بنایا گیا ہے۔ قانون کی پابندی انسان کے لیے کیوں ضروری ہے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے شاہ صاحب نے اس حقیقت کا جائزہ لیا کہ قانون کی نظر میں برّ (اچھائی) اور اِثم (برائی) یا نیکی اور بدی کے تصورات کی اساسیات کیا ہیں، پھر نیکی کو غالب کرنے اور برائی کو مغلوب کرنے کی سیاسی حکمت عملی اور طریقہ کار کیا ہے، چنانچہ شاہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

**ورأیت ان تفاصیل اسرار الشرائع ترجع الیٰ اصلین: مبحث البر والاثم، و مبحث السیاسات الملیہ.(2)**

''میرا مشاہدہ ہے کہ تمام قوانین وضوابط اور شرائع کے اسرار و رموز کا خلاصہ دو اصولوں پر مشتمل ہے: ایک یہ کہ نیکی اور بدی کی حقیقت پر بحث کی جائے، اور دوسرے سیاستِ ملیہ کے قیام کو زیرِ بحث لایا جائے''۔

گویا شاہ صاحب کے نزدیک ایک تو قانون کی نظر میں اچھائی کے اچھا ہونے اور برائی کے بُرا ہونے کی حقیقت معلوم کرنا ضروری ہے اور دوسرے یہ کہ جو اچھائی یا عمدہ قانون معلوم ہوجائے، اسے دنیا میں غالب کرنے اور جو برائی یا غلط قانون معلوم ہوجائے، اسے دنیا میں مغلوب کرنے کی سیاست کرنا ضروری ہے، یوں شاہ صاحبؒ کے نزدیک دین اور سیاست شرائع الٰہیہ کے لوازمات میں سے ہے۔

## فلسفۂ دین و سیاست کا بنیادی خاکہ

قرآن حکیم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو وہ احکاماتِ الٰہیہ پر مشتمل ہے۔ یہ احکاماتِ الٰہیہ ''اَلْبِـــرّ'' پر مبنی معروفات کی شکل میں ہیں، جنہیں رو بہ عمل لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جو کام ''اَلْاِثْـــمُ'' پر مبنی منکرات کی شکل میں ہیں، ان سے منع کر دیا گیا، اسی طرح قران حکیم نے معروفات کا نظام غالب کرنے اور منکرات کے نظام کو ختم کرنے کا سیاسی طریقہ کار بھی واضح کیا ہے۔ اور اس کے لیے انبیاء علیہم السلام اور ان کی تربیت یافتہ حواریین اور صحابہ کرام کی ذمہ داریوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

اس تناظر میں شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف مباحث کی جو ترتیب قائم کی ہے، اس میں ان دونوں اُمور کو پیش نظر رکھا ہے۔ برّ و اِثم کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے پانچ مباحث کا تعین کیا گیا ہے۔ اور سیاست ملیہ کی حقیقت سمجھنے کے لیے دو مباحث کا تعین کیا گیا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے مقدمے میں فرماتے ہیں کہ برّ و اِثم کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تین بنیادی مباحث پیش نظر رہیں:

(۱) قانونِ مجازات: یعنی اچھائی پر جزاء اور برائی پر سزا کے تلازم کو سمجھا جائے۔

(۲) مبحث الارتفاقات: یعنی انسانی کی طبعی اور جسمانی ضروریات کی تکمیل کے بنیادی ارتفاقات اور ان کے

مختلف درجات کو سمجھا جائے۔

(۳) سعادتِ نوعیہ: یعنی نوعِ انسانیت کی فلاح و بہبود کی بنیادی اقدار اور اخلاق کا تعین کیا جائے اور ان کے حصول کے راستے کی رکاوٹوں (حجابات) اور ان کے ختم کرنے کا طریقہ کار سمجھا جائے۔

لیکن ان تین مباحث کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھا جائے کہ خود حضرتِ انسان کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ اور کائنات کیا ہے؟ اور کائنات کا نظام کن اصولوں پر کام کر رہا ہے؟ اس کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کا تعلق کائنات میں جاری نظام کے ساتھ کیسے ہے؟ گویا کہ سزا و جزا کے بنیادی اسباب کا پتہ چلانا ضروری ہے۔ اس تناظر میں حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ کی پہلی قسم میں سات مباحث کو واضح کیا ہے، جس میں پہلی پانچ "بِرّ و اِثم" کی حقیقت واضح کرنے کے لیے ہیں، اور آخری دو مبحث سیاستِ ملیہ کے بنیادی نظام سے متعلق ہیں۔

## (الف) کائنات کا نظام: اللہ تعالیٰ کے کمالاتِ اربعہ کا مظہر

کائنات کی تخلیق، اس میں جاری نظام، اس میں نوعِ انسان کا مقام وغیرہ اُمور پر پہلا مبحث ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے چار کمالات جاری ہیں۔ (۱) ابداع، (۲) خلق، (۳) تدبیر، (۴) عالم مثال اور ملاء اعلیٰ کی صورت میں تدلیات کا نظام۔ یہ کائنات ان کمالات کا اظہار ہے۔ اور پھر انسان کی حقیقت یہ بتلائی کہ وہ ملکیت اور بہیمیت کا مجموعہ ہے، انسان کے ان دونوں تقاضوں کو اعتدال کے ساتھ پورا کرنے میں ہی انسانیت کی ترقی ہے۔

## (ب) دنیا وآخرت میں جزاء وسزا کا نظام

اچھائی پر جزا اور برائی پر سزا کے قانون کو کائنات میں جاری نظام کے تناظر میں سمجھانے کے لیے شاہ صاحب نے دوسرا مبحث مجازات کے عنوان سے قائم کیا ہے اور اس میں جزا وسزا کے حوالے سے دنیا اور آخرت میں پیدا ہونے والے نتائج کی وضاحت کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ اس کے بغیر دنیا میں کوئی نظام جاری نہیں ہوتا۔

## (ج) انسانی سوسائٹی کی تشکیل کے چار ارتفاقات

تیسرا مبحث ارتفاقات سے متعلق ہے، یعنی انسان کے بہیمی اور حیوانی تقاضوں کو انسانی دائرہ میں لانے کے لیے جن سہولتوں کے نظام یعنی ارتفاقات کی ضرورت ہے، ان کا تعین کیا ہے۔ اور واضح کیا ہے کہ ان ارتفاقات کی چار سطحیں ہیں: (۱) ارتفاقِ اول یعنی انسانی جسمانی ساخت اور اس کے اظہارات کے لیے حیوانی سطح سے بلند ہونے کے بنیادی اُمور کا تعین کیا گیا ہے، (۲) ارتفاقِ ثانی یعنی انسانی اجتماعیت کی پہلی بنیادی اکائی خاندانی سسٹم اور اس کے بنیادی اُمور کا تعین کیا گیا ہے، (۳) ارتفاقِ ثالث یعنی انسانی معاشرے کے مختلف شعبوں میں وجود میں آنے

www.rahimia.org

والی جماعتوں کے مربوط قومی نظام اور اس کے بنیادی اُمور کا تعین کیا ہے، (۴) ارتفاقِ رابع یعنی اقوامِ عالم اور مختلف ممالک کے درمیان بین الاقوامی تعلقات اور عالمی نظام کے بنیادی اُمور کی نشاندہی کی گئی ہے۔ گویا شاہ صاحبؒ کے نزدیک انسانی معاشروں کی ساخت، اُن کی بناوٹ، اُن کے طرزِ زندگی کی تکمیل، ان چار ارتفاقات کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اسی لیے شاہ صاحب اس مبحث کے آخری باب میں لکھتے ہیں:

**اعلم ان الرسوم من الارتفاقات بمنزلة القلب من جسد الانسان، و ایاها قصدت الشرائع اولا و بالذات، و عنها البحث فی النوامیس الالٰهیه و الیها الاشارات. (3)**

''جاننا چاہیے کہ (انسانی معاشرے میں) ارتفاقات کا عملی نظام ایسی حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ انسانی جسم میں دل کی حیثیت ہوتی ہے، اور شرائع الٰہیہ کا اولین مقصد یہی ارتفاقات ہوتے ہیں، اور نوامیس الٰہیہ میں انہی سے بحث کی جاتی ہے، اور انہی کی طرف اشارات بیان کیے جاتے ہیں''۔

## نبی اکرمؐ کی بعثت کا اساسی مقصد، ارتفاقِ رابع کی تکمیل

پھر شاہ صاحبؒ نے قرآن حکیم کے نزول اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بنیادی مقصد بھی ارتفاقِ رابع کی تکمیل کو قرار دیا ہے، چنانچہ البدور البازغہ میں لکھتے ہیں:

**فبعث الله محمداً رسوله صلی الله علیه وسلم فبرز الدین الحنیفی بروزهٔ علی وطیرة الارتفاق الرابع، فتم امر الله تعالیٰ و وقع ما اراد، وشرح هذا الرسول الملة الحنیفیة شرحاً سمحاً واضحاً. (4)**

''پس اللہ تبارک و تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول بنا کر بھیجا، انہوں نے دینِ حنفی کو ارتفاقِ رابع کی عالمی سطح پر خوب ظاہر و غالب کردیا، اور یوں اللہ کا حکم غالب آگیا، اور جو اللہ نے چاہا تھا، وہ مکمل ہوگیا، اور یوں ملت حنیفیہ کی شرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عام فہم انداز میں بہت وضاحت کے ساتھ بیان کردی''۔

## سوسائٹی میں فساد کی صورت میں انقلابی جدوجہد کی اہمیت

ارتفاقات کی بحث کے آخری باب میں شاہ صاحبؒ نے یہ بھی لکھا ہے:

**"یجب بذل الجهد علی اهل الآراء الکلیة فی اشاعة الحق و تمشیته و اخمال الباطل وصده فربما لم یمکن ذالک الا بمخاصمات او مقاتلات فیعد کل ذالک من افضل اعمال البر". (5)**

''مفادِ عامہ کی سوچ رکھنے والوں پر یہ بات واجب ہے کہ وہ حق کے پھیلاؤ اور غلبہ کے لیے اور باطل کو مٹانے اور روکنے کے لیے جدوجہد اور کوشش کریں اور بسا اوقات یہ کام اُس وقت تک ممکن نہیں

ہوتا، جب تک کہ فرسودہ نظام کو توڑنے کے لیے لڑائی و مزاحمت (انقلاب) کا عمل اختیار نہ کیا جائے، ایسے زمانہ میں یہ کام کرنا نیکیوں کے تمام اعمال سے افضل ہوتا ہے"۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسانی معاشروں میں مفادِ عامہ کے لیے کام کرنے والے لوگ اور نظام نہ رہے اور انفرادی مفادات کے حصول پر مبنی نظام قائم ہوجائے تو اس کے خلاف مزاحمت اور انقلاب برپا کرنا مفادِ عامہ کی سوچ رکھنے والوں پر لازم ہے۔

## (د) انسانیت کے چار بنیادی اخلاق

حجۃ اللہ البالغہ کے چوتھے مبحث میں شاہ صاحبؒ نے نوعِ انسانی کی دنیا وآخرت میں کامیابی کی اساسی اقدار کا تعین کرتے ہوئے چار بنیادی اخلاق کی نشاندہی کی ہے: (۱) طہارت، (۲) اخبات الی اللہ، (۳) سماحتِ نفس، (۴) اور ملکۂ عدالت پر مبنی اخلاقِ اربعہ سے انسانی زندگی کی ملکی خصوصیات کا اظہار ہوتا ہے، یہ چار بنیادی اخلاق معاشرے کے چار ارتفاقات کے ساتھ مل کر انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں کی تکمیل کرتے ہیں۔

## (ھ) اچھائی اور برائی کی جامع تعریف

پانچویں مبحث میں برّ و اِثم کی حقیقت کا جائزہ لیتے ہوئے شاہ صاحب ان دونوں کی بڑی جامع تعریف متعین کرتے ہیں، چنانچہ اَلبِرّ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

**فالبر: (۱) کل عمل یفعله الانسان قضیة لانقیادہٖ للملاء الاعلیٰ و اضمحلاله فی تلقی الالهام من الله و صیرورتهٖ فانیا فی مراد الحق (۲) و کل عمل یجازی علیه خیراً فی الدنیا او الآخرۃ، (۳) و کل عمل یصلح الارتفاقات التی بنی علیها نظام الانسان (۴) و کل عمل یفید حالة الانقیاد و یدفع الحجب. (6)**

"پس نیکی یہ ہے (۱) ہر وہ عمل جسے انسان ملاءِ اعلیٰ کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے کرتا ہے، اور اللہ کی جانب سے آنے والے الہام واحکامات کے قبول کرلینے میں اپنے آپ کو مٹا دیتا ہے، اور حق تبارک و تعالیٰ کی مراد کو غالب کرنے کے لیے اپنے آپ کو فنا کردیتا ہے، (۲) اور ہر وہ عمل جس کا دنیا یا آخرت میں اچھا بدلہ اور جزا ملے، (۳) اور ہر وہ عمل جس سے وہ ارتفاقات درست ہوتے ہوں، جن پر انسانی نظام کی بنیاد قائم ہے، (۴) اور ہر وہ عمل جو (اخلاقِ اربعہ پر عمل کرنے کے نتیجہ میں) فرمانبرداری کی حالت پیدا کرنے میں مفید ہو اور رُکاوٹوں کو دور کرنے کا سبب بنے"۔

اسی طرح شاہ صاحب نے اس مبحث میں اثم کی تعریف بھی کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

**والاثم: (۱) کل عمل یفعله الانسان قضیة لانقیادہ للشیطان و صیرورته فانیاً فی مرادہٖ، (۲) و کل عمل یجازی علیه شراً فی الدنیا او الآخرۃ (۳) و کل عمل یفسد**

**الارتفاقات، (۴) و کل عمل یفید هیئة مضادة للانقیاد و یؤکد الحجب. (7)**

''اور اثم یہ ہے کہ (۱) ہر وہ عمل جو انسان شیطانی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے کرتا ہے، اور اپنے آپ کو طاغوت کے مقاصد کے پورا کرنے میں فنا کر لیتا ہے، (۲) اور ہر وہ عمل جس کا دنیا یا آخرت میں بُرا بدلہ دیا جائے، (۳) اور ہر وہ عمل جو ارتفاقات (اربعہ) کو فاسد کر دے، (۴) اور ہر وہ عمل جس سے فرمانبرداری کے متضاد ہیئت وشکل پیدا ہوتی ہو اور اخلاقِ اربعہ کے حصول میں رُکاوٹوں کو پختہ کرے''۔

## (و) سیاستِ ملیہ کی اہمیت

حجۃ اللہ البالغہ کا چھٹا مبحث سیاستِ ملیہ کے بیان میں ہے، جس میں اچھائی یعنی ''البــــرّ'' کو غالب کرنے اور برائی یعنی ''الاثـــــم'' کو مغلوب کرنے کی سیاست کی ضرورت و اہمیت، سیاست کے تقاضے، اس کی ذمہ داریاں اور سیاسی حکمت عملی کے بنیادی اُمور کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس طرح سیاست سے متعلقہ بنیادی اساسیات کو واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

**فیحتاجون الی عالم بالسنة الراشدة یسوسهم و یأمر بها و یحض علیها و ینکر علی مخالفتها. (8)** ''پس لوگوں کو رُشد و ہدایت پر مبنی قوانین اور ضوابط جاننے والے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہوتی ہے، جو ان کی سیاست کرے اور انہیں رُشد و ہدایت کا حکم دے اور انہیں اس پر عمل کے لیے اُبھارے اور اس کی مخالفت کرنے والوں سے مزاحمت کرے''۔

اس طرح شاہ صاحبؒ نے سیاست کی اہمیت واضح کی ہے، اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے جانشین مفھمین کی جماعت کی ذمہ داریوں کا تعین کیا ہے، اور بنیادی سیاسی قاعدے اور ضابطے متعین فرمائے ہیں۔

## (ز) سیاسی حکمت عملی کے اجتہادی اُمور

ساتواں مبحث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ سے مستنبط شدہ قوانین اور شرائع کا تعین کرنے میں ہے، یعنی برّ و اِثم اور سیاسی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قوانین اور ضوابط اور احکامِ شریعت بیان فرمائے ہیں، اس کے استنباط کا طریقہ اس مبحث میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام انسانی معاشروں کی تشکیل کے لیے قانون سازی کے اُمور، انتظامی اقدامات کے بنیادی نظام اور قانون پر عملدرآمد کے عدالتی اُمور پر کس طرح گرفت رکھتے ہیں، اور ان کی انجام دہی کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے۔

اس طرح شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ کی پہلی قسم میں قرآن حکیم کے علوم و معارف کا ایک مکمل اور جامع فلسفہ وفکر مرتب اور مدون کر دیا ہے، اور اس کتاب کی دوسری قسم میں ان اساسیات کی بنیاد پر قرآنی احکامات اور نبوی ارشادات کے اسرار و رموز کو بڑی تفصیل کے ساتھ ابوابِ فقہ کے مطابق کھول کر بیان کر دیا ہے۔ یہ ہے خلاصہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اُس تجدیدی کارنامے کا، جو انہوں نے قرآن حکیم کی تعلیمات کے فہم اور ان کے غالب کرنے کی

حکمت عملی کے طور پر متعین کیا ہے۔

## (۲) قرآن حکیم کی تفسیر کے اساسی اصول:

شاہ صاحبؒ کے اسلوبِ تفسیر کا دوسرا اہم ترین پہلو اصولِ تفسیر کا تعین کرنا ہے، چنانچہ آپ نے گزشتہ تفسیری ورثہ پر نظر کرتے ہوئے، قرآنِ حکیم کے علوم ومعارف کا انتہائی تدبر کے ساتھ جائزہ لیا۔قرآنِ حکیم کے اس ہمہ جہتی مطالعہ کی وجہ سے آپ کے سامنے تفسیر قرآن کے بنیادی اساسی اصول منقح ہوکر سامنے آگئے، چنانچہ آپ نے منفرد انداز میں اصولِ تفسیر کی بنیادی کتاب ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر''، لکھی، گزشتہ چودہ سوسالوں میں اصول تفسیر پر لکھی جانے والی کتابوں میں یہ کتاب بڑی جامع حیثیت رکھتی ہے۔ان اصولوں کی روشنی میں قرآنِ حکیم کا ایک ایسا تفسیری اسلوب سامنے آتا ہے، جس سے عام فہم انداز میں قرآن حکیم کی تعلیمات کے تمام پہلو، اس سے استفادہ کرنے والے کے قلب ودماغ تک جا پہنچے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی تمام قیل وقال سے جان چھوٹ جاتی ہے، اور قرآنِ حکیم کی حقیقی تعلیمات کا اثر دل ودماغ تک منتقل ہوتا جاتا ہے۔

## شاہ صاحبؒ کے بیان کردہ اُصولِ تفسیر کا بنیادی خاکہ

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب ''الفوز الکبیر'' کا تحلیل وتجزیہ کیا جائے تو درج ذیل اُمور واضح ہوتے ہیں:

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب قرآن حکیم کے معانی منطوقہ کے حوالہ سے پانچ علوم پر مشتمل ہے۔شاہ صاحب کے مطابق قرآن حکیم کے الفاظ ونصوص کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ان سے براہِ راست سمجھے جانے والے معانی سے درج ذیل علوم واضح ہوتے ہیں۔

### (1) انسانی سوسائٹی کی تشکیل کے بنیادی احکامات اور نظامِ فکر وعمل

**علم الاحکام:** پہلا علم انسانی سوسائٹی کی تشکیل کے بنیادی احکامات، قوانین اور ضوابط پر مشتمل ہے، اس علم الاحکام میں بنیادی عقائد، عبادات کا طریقہ، گھریلو معاملات سرانجام دینے کے اصول وضوابط، قومی اور بین الاقوامی سطح پر سیاست، معیشت سے متعلق احکامات ونظامِ زندگی کی تفصیلات ملتی ہیں، الغرض احکامات کی صورت میں قرآن حکیم انسانی سوسائٹی کی تشکیل کا بنیادی فکر وفلسفہ، سیاسی، معاشی اور سماجی نظام کی بنیادی اقدار اور ان کو سوسائٹی میں قائم کرنے کی حکمت عملی بیان کرتا ہے۔ اور شریعتِ الٰہیہ اس مکمل نظامِ فکر وعمل کو انسانی ترقی کے لیے لازمی اور ضروری سمجھتی ہے۔

### (2) غلط نظامِ فکر وعمل رکھنے والوں سے مباحثہ

**علم المخاصمه:** اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی فکر وعمل اس وقت درست قرار پاتا ہے، جب وہ قوتِ

www.rahimia.org

عقلیہ کے حوالہ سے علمِ صحیح پر مشتمل ہو اور اسی طرح قوتِ عملیہ کے حوالہ سے عملِ صحیح پر مشتمل ہو، چنانچہ قرآنی نظامِ فکر و عمل کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ علم صحیح اور عمل صحیح کے تقاضوں پر پورا اُترتا ہے۔ اور ان دونوں کی جامعیت کا حسین مرقع ہے۔ اور ہر دور کی انعام یافتہ جماعت کی کامیابی اس کے علمِ صحیح اور عملِ صحیح کی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے۔ جب کہ دیگر افکار و نظریات اور فرسودہ مذاہب میں یا تو علمِ صحیح کی کمی ہے، یا عملِ صحیح کے حوالہ سے نقص پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے ایسے گروہوں سے مباحثہ اور مکالمہ کیا ہے، جو عقائد و افکار اور اعمال و کردار کا ایسا مجموعہ اپنے پیش نظر رکھتے ہیں، جو نہ علمِ صحیح پر مشتمل ہے اور نہ ہی عملِ صحیح کا آئینہ دار ہے۔ ایسے گروہ ممکنہ طور پر چار ہی ہو سکتے ہیں:

(۱) ایک گروہ وہ ہے جس کے پاس نہ علمِ صحیح ہے، اور نہ عملِ صحیح ہے، بلکہ اندازے قائم کر کے غلط عقائد و افکار اور فرسودہ اعمال و کردار کا اظہار کرتے ہیں، اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۝ (9) (یہ لوگ محض گمان پر مبنی خیالات و افکار کی اتباع کرتے ہیں، اور صرف اندازے لگاتے ہیں۔) اس گروہ کے نمائندہ مشرکین ہیں۔

(۲) دوسرا وہ گروہ ہے، جو اہلِ کتاب ہونے کے ناطے علم تو کسی درجہ میں رکھتے ہیں، لیکن اس پر عمل اس لیے نہیں کرتے کہ ان کے مالی مفادات، یا اقتدار خطرہ میں پڑتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (10) (جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کتاب میں نازل کیا ہے، یہ لوگ اسے چھپاتے ہیں، اور اسے تھوڑی قیمت پر فروخت کرتے ہیں) یہ لوگ یہودی خصلت ہیں۔

(۳) تیسرے وہ گروہ جو عمل تو بڑی کثرت سے کرتے ہیں، لیکن علم صحیح سے محروم ہیں۔ اور عقل و شعور کا استعمال نہیں کرتے۔ وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (11) (رہبانیت انہوں نے خود گھڑی ہے، ہم نے ان پر اسے فرض نہیں کیا تھا) یہ لوگ نصرانی خصلت ہیں۔

(۴) چوتھے وہ گروہ جو بظاہر ایمان لانے اور قرآن کے علم صحیح اور عمل صحیح پر مشتمل نظامِ فکر و عمل کو ماننے کا بظاہر اعلان کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ منافقت سے کام لیتے ہیں: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۝ (12) (لوگوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں، جو کہتے ہیں ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، حالانکہ وہ ایمان والے نہیں) یہ لوگ منافقین ہیں۔

قرآن حکیم ان چاروں گروہوں کے مزعوماتِ باطلہ، ان کے عقائد فاسدہ اور غلط اعمال کا رد کرتا ہے، انہیں جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (13) (ان سے مباحثہ ایسے طریقے سے کیجیے جو عمدہ ہو) کے اصول پر مباحثہ و مکالمہ کرتا ہے اور صحیح علم و عمل پر مبنی قرآنی نظامِ فکر و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ اور یوں اپنے نظامِ فکر و عمل اور احکام کی حقانیت اور درستگی کا اظہار کرتا ہے۔

## دینی نظامِ فکر وعمل کی حقانیت کے دلائل

پھر کسی نظامِ فکر وعمل کی درستگی کی ایک بڑی اہم دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ ماضی میں اچھے نتائج دے چکا ہے، حال کا تقاضہ ہے کہ اُس نظامِ فکر وعمل پر عمل کیا جائے، اسی طرح مستقبل میں اس نظامِ فکر وعمل کے اچھے نتائج آئیں۔ چنانچہ اس تناظر میں قرآن حکیم میں تین علوم مزید بیان کئے گئے، ایک کا تعلق انسان کے گردو پیش کے موجودہ حالات و واقعات سے ہے (آلاء اللہ) دوسرے کا تعلق ماضی میں اس کے نتائج کے حوالہ سے ہے (ایام اللہ) اور تیسرے کا تعلق مستقبل میں نتائج کے اظہار کے حوالہ سے ہے (تذکیر بالموت ومابعدہ)۔ چنانچہ اگلے تین علوم کا تعلق ماضی، حال اور مستقبل کے حوالہ سے ہے۔

## (3) گردو پیش میں موجود انعاماتِ الٰہیہ سے استدلال

**علم التذکیر بآلآء الله:** قرآن حکیم اپنے نظامِ فکر وعمل کو انسانیت کے سامنے رکھتے ہوئے انہیں گردو پیش میں موجود انعامات الٰہیہ کی حقیقت پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ اور یہ واضح کرتا ہے کہ جس ذات باری تعالیٰ نے یہ انعامات انسانی ترقی کے لیے رکھے ہیں، اسی ذات نے انسانی معاشروں کی فلاح و بہبود کے لیے یہ قرآنی احکامات جاری فرمائے ہیں، اس لیے اس پر عمل کرنا گردو پیش میں موجود انعامات پر غور وفکر کا لازمی نتیجہ ہونا چاہئے۔

## (4) ماضی کی تاریخ سے استدلال

**علم التذکیر بایام الله:** یعنی قرآن حکیم اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ اس کے نظامِ فکر وعمل کے اساسی اصولوں کی کامیابی پر گزشتہ ماضی کی تاریخ بھی مہر تصدیق ثبت کرتی ہے، ان اصولوں پر عمل کرنے والی انسانی جماعتوں، خاص طور پر انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور وہ انعام یافتہ ہوئے اور نہ ماننے والے گروہ، فرعون ونمرود، شداد و ہامان اور نافرمان اقوام ان اصولوں پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئیں، کسی نظامِ فکر وعمل کو پرکھنے کا سب سے اچھا طریقہ ماضی کے تاریخی نتائج کو سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات ماضی کی تاریخ کا تجزیہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس سے اس نظامِ فکر وعمل کی حقانیت ثابت ہوتی ہے۔

## (5) مستقبل میں موت اور اس کے بعد کے نتائج سے استدلال

**علم التذکیر بالموت و مابعده:** یعنی قرآنی نظامِ فکر وعمل پر پورے طور پر عمل کرنے کے اثرات مستقبل میں بھی کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوں گے، خاص طور پر موت اور اس کے بعد عمدہ نتائج نکلیں گے، قرآنی احکامات پر عمل کرنے سے موت اور اس کے بعد کے مراحل میں کامیابی ہوگی، اور نہ ماننے کی صورت میں عذابِ الٰہی کا نزول ہوگا۔

قرآن حکیم کے الفاظ ونصوص کے معانی منطوقہ ان پانچ علوم کے حامل ہیں، ان میں بنیادی علم ''علم الاحکام'' ہے اور باقی چار علوم، علم الاحکام پر مبنی نظامِ فکر وعمل کی حقانیت کے اثبات اور اس کے مفید و مثبت نتائج کو سمجھانے کے

www.rahimia.org

لیے ہیں۔

## نزولِ قرآن کا بنیادی مقصد:

اس باب میں شاہ صاحبؒ نے چند اصولی باتوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے قرآن حکیم کے نزول کا بنیادی مقصد ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''امامحقق آں است کہ قصد اصلی از نزولِ قرآن تہذیبِ نفوسِ بشریت، و درہم شکستن عقائدِ باطلہ و اعمالِ فاسدۂ ایشاں''۔(14) (تحقیقی بات یہ ہے کہ نزولِ قرآن کا بنیادی مقصد نفوسِ انسانی کی تہذیب و تربیت ہے، اور غلط افکار و عقائد اور فرسودہ اعمال کو ختم کرنا ہے)۔

## آیات کے شانِ نزول کا صحیح نقطۂ نظر:

شاہ ولی اللہ صاحبؒ آیات کے شانِ نزول کے حوالہ سے یہ بنیادی رہنمائی بھی فراہم کرتے ہیں:

''پس وجودِ عقائد باطلہ در مکلفین سبب نزول آیات مخاصمہ است، و وجودِ اعمالِ فاسدہ وجریانِ مظالم درمیان ایشاں سبب نزول آیاتِ احکام است، و متنبہ نہ شدن ایشاں بذکر آلآء اللہ و ایام اللہ و وقائع موت و مابعد آں، سبب نزول تذکیر است، خصوصیاتِ قصص جزیہ کہ تصدیع روایات آں کشیدہ است چنداں دخیل نیست، الا در بعضے آیات کہ آنجا تعریض است بواقعے از وقائعے کہ در زمانِ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم واقع شدہ یا پیش از زمان آنحضرت بظہور پیوستہ اند، وانتظارے کہ سامع را از شنیدن آں تعرض حاصل مے شود بدون بسط قصہ زائل نمے گردد''۔(15)

(انسانی معاشرے میں غلط عقائد و افکار کا موجود ہونا، آیاتِ مخاصمہ کے نزول کا سبب ہے، اور فرسودہ اعمال اور ظلم و ستم کے نظام کا موجود ہونا، آیاتِ احکام کے نزول کا سبب ہے، اور گرد و پیش میں موجود اللہ کی نعمتوں کو پیش نظر نہ رکھنا اور ماضی کے تاریخی واقعات سے عبرت حاصل نہ کرنا اور موت و مابعد الموت کے نتائج پر نظر نہ رکھنا، سبب ہے آیاتِ تذکیر کے نزول کا، اور جو عام مفسرین نے ہر آیت کے حوالے سے مخصوص شانِ نزول کے لیے روایات جمع کی ہیں، اُس کا اس میں کچھ دخل نہیں، ہاں البتہ بعض آیات کہ جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہونے والے کسی واقعہ کی طرف اشارہ موجو ہو یا آپ سے پہلے کے زمانہ میں کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوا اور سننے والے کو اس واقعہ کو سُنے بغیر آیات کا مطلب سمجھ میں نہ آئے، ایسے موقع پر واقعہ بیان کیا جاسکتا ہے)۔

# تفسیر قرآن کے سمجھنے میں مشکلات اور ان کا حل

الفوز الکبیر کے دوسرے باب میں شاہ صاحب نے قرآن حکیم کے معانی سمجھنے میں کسی دور کے لوگوں کو جو

www.rahimia.org

مشکلات پیش آسکتی ہیں، ان کی نشاندہی کرنے اور ان کے حل کرنے کا صحیح طریقہ کار بیان کیا ہے۔ اور دس ایسی وجوہات کا تعین کیا ہے، جن کے سبب سے مفاہیم قرآن کے سمجھنے میں رُکاوٹ ہوسکتی ہے، اور پھر شاہ صاحبؒ نے بڑی جامعیت کے ساتھ ان وجوہات کو حل کرنے کے بنیادی اُمور کی نشاندہی کی ہے، اور اہم اُمور پر نپی تلی گفتگو کی ہے۔ خاص طور پر شرحِ غریب القرآن، ناسخ ومنسوخ کی بحث اور سبب نزول، ایسے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

## اسلوبِ قرآن کی حقیقت

الفوز الکبیر کے تیسرے باب میں اُسلوبِ قرآن کی منفرد حیثیت ہونے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے سب سے پہلے اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ قرآن حکیم باقاعدہ ابواب اور فصول کے طور پر مرتب نہیں کیا گیا، بلکہ قرآن حکیم کا اُسلوبِ ترتیب مکتوبات اور احکام وفرامین کے مجموعہ کی صورت میں ہے، کائنات کا نظام چلانے اور انسانی نوع کو کامیاب بنانے کے لیے شہنشاہِ عالم یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعہ احکام وفرامین جاری فرمائے ہیں، قرآن حکیم کی ہر سورۃ انہی احکامات وفرامین پر مشتمل ہے، اس طرح سورتوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کرنے سے ان احکامات کا ایک مجموعہ ''مصحف قرآنی'' کی صورت میں مرتب کردیا گیا۔ دوسری حقیقت شاہ صاحبؒ نے یہ بیان کی ہے کہ آیاتِ قرآنی کی ترتیب وتنسیق بھی عام انسانیت کے عمومی ادبی ذوق کو سامنے رکھتے ہوئے کی گئی ہے، کسی خاص قوم کے لسانی ذوق کو سامنے رکھ کر فواصل آیات کا تعین نہیں کیا گیا۔ اسی طرح اس باب میں معانی اور مفاہیم کے اُسلوبِ قرآنی کو بیان کرتے ہوئے بھی شاہ صاحب نے نہایت عمدہ فوائد بیان کئے ہیں اور اعجازِ قرآن کی چند بہترین وجوہات کا تعین کیا ہے۔

## تفسیر قرآن کے دائرے کی وسعت اور اس کی اقسام

الفوز الکبیر کا چوتھا باب فنونِ تفسیر کے بیان میں ہے، جس میں اُسلوبِ تفسیر قرآن کے حوالہ سے سات قسم کی تفسیروں کا تعارف کرایا گیا ہے، چنانچہ محدثین، متکلمین، فقہاء اصولیین، نحویین، اُدباء، قراء اور صوفیاء کی تفسیروں پر مشتمل سات قسم کے اُسلوبِ تفسیر کی نشاندہی کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ ہر ایک نے اپنے اپنے علم وفن کو سامنے رکھ کر قرآن حکیم کے معانی اخذ کرنے اور اپنے علم وفن کی بنیاد پر تفسیر کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اور پھر فرماتے ہیں:

''بالجملہ میدان (تفسیر) واسع اَست وقصد ہر مسلمانے بتفہیمِ معانیٔ قرآن متعلق شدہ است، وہر کسے در فنے خوض نمودہ است و بقدرِ قوتِ فصاحت وفہمِ خود سخن گفتہ است و مذہب اصحابِ خود را منظورِ نظر داشتہ است، ازیں جہت فنِ تفسیر وسعتے پیدا کرد، کہ بتقر راست نیاید، و در کتب بسیار پدید آمد، کہ بشمار محصور نشوند''۔ (16)

''مختصر یہ کہ تفسیر کا میدان بڑا وسیع ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان قرآن مجید کو سمجھنا اور اس کے

مسائل میں غور کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تفسیر قرآن سے دلچسپی لینے والوں کی کمی نہیں، لیکن ان تمام لوگوں نے ایک ہی حیثیت سے قرآن کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ ہر شخص نے اپنے اپنے ذوق اور رُجحانِ طبع کے مطابق ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے اور اپنے جودتِ طبع اور قوتِ بیان کی انتہائی پنہائیوں کے ساتھ دادِ سخن دینے کی کوشش کی ہے، ساتھ ہی ساتھ اپنے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگوں کی تائید اور حمایت کا بھی فریضہ انجام دیا ہے، جس کی وجہ سے فنِ تفسیر میں اتنی وُسعت پیدا ہوگئی ہے، کہ اس کا بیان کرنا مشکل ہوگیا ہے بلکہ کتبِ تفسیر کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیان کرنا تو بڑی بات ہے، سب کا شمار کرنا بھی ناممکن ہے''۔(17)

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے ان تمام اسالیب تفسیر کا تحلیل و تجزیہ پیش کیا ہے، اور ہر ایک اُسلوبِ تفسیر کے بنیادی اُمور کی نشاندہی کر کے ان کا خلاصہ بیان کردیا ہے، اور علومِ خمسہ کی اساس پر تمام اسالیب تفسیر کی ذیلی شقوں کا جائزہ لیا ہے اور پھر ہر ایک اُسلوبِ تفسیر میں جو کمزوریاں ہیں، ان کی نشاندہی کی ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ متکلمین کے طریقہ تفسیر میں متشابہات کی تاویل میں جو غلو پایا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے، اور اسی طرح فقہاء کی تفسیر میں فروعی اختلافات کے حوالہ سے اپنے اپنے مذاہب پر آیات کو منطبق کرنے کے طریقہ کار کو درست قرار نہیں دیا، اسی طرح نحویوں اور صرفیوں کا قرآنی آیات کو اپنے مذہب نحوی اور صرفی پر منطبق کرنے پر بھی شاہ صاحبؒ نے تنقید کی ہے، اسی طرح معانی اور بیان کے لوگوں نے اپنے فنی اُصولوں کو قرآنی آیات پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے، اس کو بھی تسلیم نہیں کیا اور اسی طرح صوفیاء کے اشارات، کشف و کشوفات اور وِجدانی اعتبارات کو بھی فن تفسیر سے دور قرار دیا ہے۔

## تفسیر قرآن میں فنِ اعتبار کی اہمیت

اسی باب میں تفسیری اُسلوب کے حوالہ سے ایک اہم فائدہ بیان کرتے ہوئے اس اہم حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ ''فنِ اعتبار'' کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی معتبر قرار دیا اور اس کی اساس پر قرآن حکیم کے مفاہیم کو سمجھنے کے اس طریقہ نبوی کو اُمت کے لیے ایک سنتِ متواترہ کہا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''دریں جا فائدہ است اہم، آں را باید دانست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ''فنِ اعتبار'' را معتبر داشتہ اند، و دراں را سلوک فرمودہ اند تا سنت باشد علمائے اُمت را، و فتح طریقے باشد علومِ موہوبہ ایشاں را، مانند آنکہ آید فاما من اعطیٰ واتقیٰ.... الخ در مسئلہ قدر تمثیل خوانند، اگر چہ معنیٰ منطوق آیت آں است کہ ہر کہ ایں کارہا کردہ است، اُو راہِ جنت و نعیم بنمایم، و ہر کہ اضدادِ آں عمل آوردہ است اُو را راہِ دوزخ و تعذیب بکشایم، لیکن بطریق کہ اعتبار تواں دانست کہ ہر کسے را برائے حالتے آفریدہ اند و آں حالت بروَے جاری

ے کنند، من حیث یدری او لا یدری، پس بایں اعتبار آیت را بہ مسئلۂ قدر ربطے واقع شد"۔(18)

"اس مرحلہ پر ایک اہم نکتہ اور بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فنِ اعتبار کو دُرست قرار دیا ہے، بلکہ اس پر بنفس نفیس عمل بھی فرمایا ہے، تاکہ اُمت کے علماء کے لیے سنت اور نمونہ ہو جائے، اور جو علوم اس اُمت کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطاء کیے گئے ہیں، انہیں سمجھنے اور ان تک پہنچنے کے لیے ایک راستہ اور کھل جائے، مثلاً آیت فاما من اعطیٰ واتقیٰ....الخ (جس نے عطاء کیا او راللہ سے ڈرا.....الخ) اس آیت کو مسئلہ قدر میں بطورِ مثال کے پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے اعمال بجا لاتے ہیں، ان کے لیے جنت اور اس کی نعمتیں ہیں، اور جو لوگ اس کے خلاف عمل کرتے ہیں، ان کے لیے جہنم اور اس کا عذاب ہے، لیکن فنِ اعتبار کی رو سے اس آیت کا یہ مطلب بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ہر شخص کو ایک مخصوص حالت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور وہ اس حالت میں مبتلا ہو کر رہتا ہے، خواہ وہ اس سے واقف ہو یا نہ ہو، اس لحاظ سے آیت زیر بحث کا مسئلہ قدر سے بھی ربط ہو گیا"۔(19)۔

اس طرح شاہ صاحب نے فنِ اعتبار کی بنیاد پر تفسیر قرآن حکیم کے اُسلوب کو نبویؐ اُسلوب قرار دیا ہے اور اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے علمائے اُمت کو اس کی پیروی کرنے کے لیے اس راہِ سنت کی نشاندہی کی ہے۔

یہاں اس بات کو سمجھا جانا از بس ضروری ہے کہ "فن اعتبار" اور صوفیہ کے "وجدانی اعتبارات" میں بڑا فرق ہے۔ شاہ صاحب نے صوفیاء کے وجدانی اعتبارات کو دائرۂ تفسیر سے خارج قرار دیا ہے، اس لیے کہ وہ افراد کی انفرادی وجدانی کیفیت سے متعلق ہوتے ہیں، انہیں تفسیری قانون کی شکل نہیں دی جاسکتی، جب کہ فنِ اعتبار کا تعلق انسانی سوسائٹی کے اجتماعی قانونی معاملات سے ہے، جنہیں قیاسِ صحیح، عقل وشعور اور مسلمہ قرآنی اصولوں کی اساس پر حل کیا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف دائرۂ تفسیر میں داخل ہے بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مسنون طریقۂ تفسیر ہے۔ جیسا کہ شاہ صاحب نے اوپر دی گئی عبارت میں حضور اقدسؐ کی اعتبار کردہ مثال سے واضح کیا ہے۔

## شاہ صاحبؒ کو عطاء کیے جانے والے علوم قرآنی

پھر اس کے بعد شاہ صاحب نے علم تفسیر میں ان فنونِ تفسیر کی نشاندہی کی ہے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص ان کو وہبی طور پر عطاء فرمائے ہیں، اور جن کی وجہ سے شاہ صاحبؒ کا اُسلوبِ تفسیر گزشتہ تمام مفسرین سے منفرد اور جامعیت کا حامل قرار پاتا ہے، اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے پانچ وہبی علوم کا تذکرہ فرمایا ہے۔

### (1) قرآنی قصصِ انبیاء کی صحیح تعبیر و تاویل کا علم:

اس علم میں شاہ صاحب نے آدم علیہ السلام سے لے کر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک انبیاء علیہم السلام کے

واقعات اور قصصِ قرآنی کا ایسا جامع اور بہترین اُسلوب پر تجزیہ کیا ہے، جس کی نظیر گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی، اس علم پر شاہ صاحبؒ نے ایک مستقل کتاب "تاویل الاحادیث" کے نام سے لکھی ہے۔

## (2) پانچ علومِ قرآنی کی دریافت اور ان کی نشاندہی:

الفوز الکبیر کے پہلے باب میں بیان کردہ پانچ علوم، جن میں تمام قرآنی آیات کا جامع خلاصہ آجاتا ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم سے ان پانچ علوم کو اخذ کرنے کا علم مجھے وہبی طور پر عطاء کیا گیا ہے۔

## (3) فارسی زبان میں ترجمہ قرآن حکیم:

شاہ صاحبؒ کو ترجمہ قرآن حکیم کا خاص علم عطاء کیا گیا ہے، چنانچہ شاہ صاحبؒ نے "فتح الرحمن بترجمة القرآن" کے نام سے پورے قرآن حکیم کا فارسی زبان میں نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ اس کا مقدمہ لکھ کر اُصولِ ترجمہ بھی متعین کردیئے اور یہ ایک ایسا ترجمہ ہے، جو عربی زبان کے بہت قریب تر اور اس کے مشابہ ہے۔

## (4) علم خواص القرآن:

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی کو آیاتِ قرآنیہ کے خواص کا علم بھی عطاء کیا گیا اور یہ علم آیاتِ قرآنیہ کو بطورِ دعا پیش نظر رکھ کر توجہ الی اللہ کے ذریعہ سے نتائج کے حصول پر مشتمل ہے، چنانچہ اسمائے حسنیٰ اور آیاتِ عظمیٰ کو خاص انداز میں پڑھنے اور ان کی وساطت سے دعاء مانگنے سے بہت عمدہ نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

## (5) حروفِ مقطعات کے معانی کے فہم کا علم:

شاہ صاحبؒ کو اس حوالہ سے ایک خاص علم عطاء کیا گیا، جس سے حروفِ مقطعات کے معانی سمجھنے کا قاعدہ اور ضابطہ متعین ہوگیا، اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے عربی لغت کے حوالہ سے چند بنیادی اُمور کی نشاندہی کی ہے، اور پھر تمام حروفِ مقطعات کے معانی متعین کیے ہیں اور اپنی کتاب "الخیر الکثیر" میں باقاعدہ تمام حروفِ تہجی کے ترتیب وار مطالب و مفاہیم بھی متعین کیے ہیں، اس علم کو عقلی سمجھانے کے لیے مزید کام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے "براهين قاسميه" میں کیا ہے۔

الغرض "الفوز الکبیر" قرآن حکیم کے اساسی اُصولِ تفسیر کے بیان میں ایک ایسی جامع کتاب ہے، کہ اُس سے قرآن حکیم کے معانی اور مفاہیم کو جاننے، اُس کے اُسلوب کو صحیح تناظر میں سمجھنے کا صحیح طریقہ کار سامنے آجاتا ہے۔

## (۳) پُر از حکمت اور جامع ترجمۂ قرآن حکیم:

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اُسلوبِ تفسیر کا تیسرا اہم پہلو قرآن حکیم کا ترجمہ اور اصولِ ترجمہ کا تعین کرنا ہے، چنانچہ جہاں آپ نے قرآنی تعلیمات کی بنیادی فلاسفی اور اساسی اصولِ تفسیر کا تعین کیا، وہاں قرآنِ حکیم کے دیگر زبانوں میں ترجمہ کی راہ کھولی اور اصولِ ترجمہ متعین کیے، تا کہ ہر قوم اپنی زبان میں ترجمہ قرآن کے ذریعہ

www.rahimia.org

قرآنی علوم و معارف کو صحیح تناظر میں سمجھ سکے، اسی لیے آپ نے سب سے پہلے ہندوستان کی عام فہم علمی زبان فارسی میں قرآنِ حکیم کا بہترین ترجمہ کیا۔ چنانچہ ترجمہ قرآن کی اہمیت بیان کرتے ہوئے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

''اگر انصاف دہی فائدۂ اصلی از نزولِ قرآن اتعاظ است بمواعظِ آں، واہتدا است بہدایت آں، نہ صرف تلفظ بآں، اگرچہ تلفظ ہم مغتنم است، پس چہ مسلمانی بدست آوردہ است، کسے کہ مدلولِ قرآن را نہ فہمد، وکدام حلاوت دارد آں کہ مدلولِ کلام اللہ نہ داند''۔ (20)

''اگر انصاف سے کام لیا جائے تو قرآن حکیم کے نزول کا اصلی فائدہ اس کے مواعظ سے نصیحت حاصل کرنا ہے اور اس کی ہدایت سے راستہ پانا ہے، نہ کہ صرف تلفظ یاد کرلینا ہے، اگرچہ تلفظ بھی غنیمت ہے، پس وہ آدمی کیسا مسلمان ہے کہ قرآن کے مفہوم کو نہیں سمجھتا اور وہ مسلمان کیسے اپنے اندر حلاوتِ ایمانی پا سکتا ہے کہ اللہ کے کلام کا معنی اور مطلب نہیں جانتا''۔

قرآنِ حکیم کی آیات ونصوص پُر از حکمت ہیں، اور بڑی جامعیت کے ساتھ نپے تلے اور جامع کلمات کی صورت میں انسانی معاشرے کے جملہ دائروں کے بارے میں بنیادی رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ ان آیات ونصوص کا ایسے ہی جامع اور پُر از حکمت اسلوب میں ترجمہ ہونا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ترجمہ ہی قرآنی علوم و معارف کو صحیح طور پر سمجھانے کا باعث بن سکتا ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ اور آپ کے صاحبزادگان کے تراجم قرآن کی یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے، جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کے تراجم ہندوستان کی قیادت کرنے والے رہنماؤں اور دہلی کے اہل زبان کے دل و دماغ میں قرآنی تأثیر پیدا کرنے کا باعث بنتے رہے ہیں۔

یہ وہ تین بنیادی اُمور ہیں، جن سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا تفسیری اسلوب اپنی جامعیت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے، ہندوستان میں قرآنی تعلیمات کے پھیلاؤ کے لیے اس اسلوبِ تفسیر نے بڑا بنیادی کردار ادا کیا، اس اسلوب پر قائم قرآنی تعلیمات کے پھیلاؤ کی تحریک آج تک پورے تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ شاہ صاحبؒ کے بعد اب تک ولی اللہی جماعت کے محققین، علمائے ربانیین اور اولیاء اللہ نے اس اسلوبِ تفسیر کو سامنے رکھتے ہوئے ہر دور میں قرآن حکیم کی تعلیمات کے پھیلاؤ کے لیے انتھک جدوجہد اور محنت کی ہے۔

## شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اُسلوبِ تفسیر کا دوسرا دَور

قرآنی تعلیمات کے حوالے سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ کا یہ وہ شاندار طرزِ فکر وعمل اور جامع اسلوب تھا جسے آپ کے بعد دوسرے دور میں آپ کے صاحبزادگان اور خانوادۂ نسبی نے پروان چڑھایا۔

www.rahimia.org

چنانچہ اولاً آپ کے عالی مقام صاحبزادگان حضرت الامام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے قرآنِ حکیم کے تراجم اور تفاسیر لکھیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے ''تفسیرِ عزیزی'' لکھی، جس میں انہوں نے اپنے والد گرامی کے مندرجہ بالا اُسلوبِ تفسیر کو سامنے رکھتے ہوئے قرآنی آیات کی تفسیر بیان کی ہے، اور ہندوستان کے بلند طرزِ تمدن کو سامنے رکھ کر قرآنی تعلیم کے جدید اسلوب کو بیان کرنے کی سعی فرمائی، اسی طرح حضرت شاہ عبد القادر دہلویؒ وغیرہم نے حکمت سے بھرپور اردو تراجم کر کے اس اسلوب تفسیر و ترجمہ کو عام کیا۔ شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے ''موضح القرآن'' لکھ کر اُردو میں قرآن حکیم کا ایسا ترجمہ کر دیا ہے، جو آئندہ آنے والے تمام ترجمہ ہائے قرآن حکیم کے لیے بطورِ بنیاد کے کام دیتا رہا، اسی طرح شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے ''تفسیر آیت النور'' ''دمغ الباطل'' جیسی کتابیں لکھ کر اپنے والد گرامی کے اُسلوبِ فلسفۂ تفسیر کو زندہ رکھا۔ ان حضرات نے اپنے والد گرامی حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مکمل فکر و فلسفہ، اُصولِ تفسیر اور اُصولِ ترجمۂ قرآن پاک کو سامنے رکھ کر نہ صرف اس حوالہ سے کتابیں تحریر فرمائیں، بلکہ شاگردوں کی ایک عظیم جماعت بھی تیار کی۔ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی برپا کردہ تحریک کو اُن کے صاحبزادگان نے بڑی ہمت و جرأت کے ساتھ پوری تندہی کے ساتھ آگے بڑھایا۔

اسی طرح حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تربیت یافتہ تلامذہ اور خلفاء کی جماعت نے بھی اُن کے فکر کو آگے بڑھانے میں بڑی جدوجہد اور کوشش کی، خاص طور پر خواجہ محمد امین ولی اللہی کشمیری اور مولانا محمد عاشق پھلتی جیسے خلفاء اور تلامذہ نے نہ صرف کتابیں تحریر کیں بلکہ شاہ صاحب کے فکر و فلسفہ کو عام کرنے کے لیے بڑی جدوجہد اور کوشش کی، یہ خانوادۂ ولی اللہی روحانی کی جدوجہد اور کوشش ہی تھی جس نے خانوادۂ ولی اللہی نسبی کے ساتھ مل کر پورے برِعظیم پاک و ہند میں قرآن حکیم کی تفسیر کے اس منفرد اُسلوب کو قریہ قریہ بستی بستی پھیلانے کے لیے انتہا درجہ کوشش کی اور کامیابی حاصل کی۔

## شاہ صاحبؒ کے اُسلوبِ تفسیر کا تیسرا دور

شاہ صاحبؒ نے قرآنی علوم کے پھیلاؤ کے لیے جو تحریک برپا کی، اس کے اثرات و نتائج آپؒ کے صاحبزادگان تک ہی محدود نہ رہے، بلکہ اگلے دور میں ولی اللہی فکر اور فلسفہ سے متأثر ہونے والے خانوادۂ ولی اللہی کے جانشین حضرات نے اس تحریک کو زندہ رکھا، چنانچہ حضرت امام شاہ محمد اسحاق دہلویؒ، الامیر الشہید سید احمد رائے بریلویؒ اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے تیسرے دور میں اسی اُسلوبِ تفسیر کو رواج دینے، اس کے مطابق درسِ قرآن کے پھیلاؤ کے لیے جدوجہد اور کوشش کی، بلکہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قائم کردہ فلسفہ اور فکر کی تفہیم کے لیے ''عبقات''، ''صراطِ مستقیم'' اور ''منصب امامت'' جیسی عظیم الشان کتابیں تحریر فرمائیں۔ اور یہی نہیں بلکہ ہندوستان پر غیر ملکی تسلط قائم ہونے کے بعد ان حضرات نے ولی اللہی فکر کی اساس پر جدوجہد آزادی اور دین اسلام کے غلبہ کا

www.rahimia.org

نظام قائم کرنے کے لیے جدوجہد اور کوشش کی، اور بقول حضرت سید صاحبؒ کہ: ''کفارِ فرنگ کہ بر ہندوستان تسلط یافتہ اند نہایت تجربہ کار و ہوشیار اند و حیلہ باز و مکار'' (21) کے خلاف جہادِ آزادی کے لیے قربانی دی۔

## اس اسلوبِ تفسیر کا چوتھا دَور اور اس کے تقاضے

پھر ان حضرات کے تربیت یافتہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور ان کی جماعت نے انتہائی جدوجہد اور جانفشانی سے قرآنی علوم و معارف اور ان کے اساس پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو قبول کیا اور اس کے لیے عملی کردار ادا کیا، چنانچہ ولی اللّٰہی علوم کی اساس پر قائم ''دِلّی مدرسہ'' کے ختم ہونے کے بعد انہی علوم کو زندہ کرنے کے لیے دیوبند کا مرکز قائم ہوا، جس میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر اور تحریک کو اس کے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ ترقی دی اور علمی اور عملی کاوشیں کیں، یہ علومِ ولی اللّٰہی کے پھیلاؤ کا چوتھا دور ہے، جس میں یہ حقیقت بھی اُبھر کر سامنے آئی کہ اس دور میں برعظیم پاک و ہند اپنی آزاد حیثیت کھو بیٹھا تھا، اور 1857ء میں نہ صرف مسلمانوں کی حکومت کا مکمل خاتمہ ہوگیا بلکہ پورا ہندوستان برطانوی سامراج کا غلام بن چکا تھا، غلامی کے اس دور میں قرآنی تعلیمات کے پھیلاؤ کے لیے کن جہتوں سے کام کرنے کی ضرورت تھی، اس کا تعین خانوادۂ ولی اللّٰہی کے ان جانشین حضرات نے بہت غور و فکر اور تدبر و بصیرت کے ساتھ کیا اور اس بات کا فیصلہ کیا کہ اس دور میں قرآنی تعلیم کی اساس پر نہ صرف ایک جماعت تیار کی جائے جو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قائم کردہ اُسلوبِ فکر و عمل اور اسلوبِ تفسیر کی حامل ہو بلکہ ایسی جماعت آزادی اور حریت کے لیے جدوجہد اور کوشش کو بھی اپنا شعار بنائے اور پوری ذمہ داری کے ساتھ غلبۂ دین کے لیے سراپائے عمل بن کر کردار ادا کرے۔

## غلامی کے دور میں قرآنی تعلیم کا بنیادی تقاضہ

مسلمانوں کے زوال اور غلامی کے دور میں قرآنی تعلیم کا جو بنیادی اثر اور لازمی تقاضہ سامنے آیا۔ وہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر حریت اور آزادی کی تحریک کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ کیوں کہ غلام قوم میں قرآنی تعلیم کا پہلا اور لازمی اثر اپنی قومی آزادی کا حصول ہوتا ہے۔ آزاد فکر و عمل کے بغیر قرآن کی مجموعی تعلیمات پر کما حقہٗ عمل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''اس نصب العین (حکومتِ الٰہی) کے ماتحت اب سوال زندگی گزارنے کا ہے، سو اس کے لیے سب سے مقدم اور سب سے آخری چیز جذبۂ آزادی ہے، جو دلوں کی رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہا ہو، کیوں کہ غلامی کے جذبہ یا اس پر قناعت سے کوئی نصب العین اور کوئی نظریہ بھی بروئے کار نہیں لایا جاسکتا، جذبۂ آزادی کے بعد زندگی کو آزاد، ضمیر کو آزاد اور عمل کو ہر رسمی ماحول سے آزاد کردینے والا پروگرام وہی اُسوۂ حسنہ ہے، جو نبی کریم ﷺ کی منظّم اور مقدس زندگی کا ایک شرعی عنوان ہے''۔(22)

## تحریک آزادی وحریت کا قرآنی تعلیم سے تعلق

اس پس منظر میں ہمیں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پوتے حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے خلیفہ اجل حضرت سید احمد شہید کی ''تحریک آزادی وحریت'' کے ڈانڈے قرآنی تعلیم کے لازمی اثر سے جڑے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور جانشین حضرت الامام شاہ محمد اسحاق دہلویؒ، دہلی کے مرکز میں بیٹھ کر اس تحریک کی بھرپور مالی امداد فرماتے ہیں۔ اور اس کے لیے ہندوستان بھر میں اپنی سرپرستی اور نگرانی میں دیگر اہم امور سرانجام دیتے ہیں۔

اس طرح خانوادۂ ولی اللہی نے جہاں اس خطہ میں قرآنی تعلیمات کی بنیادی فلاسفی، اس کے اصول اور عام فہم انداز میں اس کی نشر واشاعت کا کام کیا۔ وہاں اپنی عملی جدوجہد کے ذریعہ قرآنی تعلیم کے لازمی اثر (تحریک آزادی وحریت) کی آبیاری کی، اس خطہ میں آزادی کا جذبہ بیدار کیا۔ اور اس کے لیے قربانیاں دیں۔

## 1857ء کی جنگ آزادی اور قرآنی تعلیم کا اثر

اس دور میں ان حضرات کے فکر وعمل کی وارث جو جماعت سامنے آتی ہے۔ اس کے سرخیل سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور آپ کے دو اجل خلفاء حضرت الامام حکیم الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہوتے ہیں۔ ان حضرات نے نہ صرف خانوادۂ ولی اللہی کے طرزِ فکر واسلوب کو آگے منتقل کیا۔ بلکہ عملی جدوجہد کر کے قربانیوں کا لازوال نقش قائم کیا۔ 1857ء میں ہمہ گیر سطح پر ہندوستان کی پہلی قومی جنگ آزادی میں شاملی وتھانہ بھون کے میدان میں جہادوحریت کا مرحلہ ہو، یا دیوبند کا مرکز قائم کر کے، ولی اللہی اصول پر قرآنی علوم ومعارف کو انسانی قلوب میں منتقل کرنے اور اس حوالہ سے جذبۂ صادقہ پیدا کرنے کا عمل ہو۔ ہر ایک دائرے میں ان حضرات کی جدوجہد ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔

## 1857ء کے بعد قرآنی تعلیم کے پھیلاؤ کا ایک اہم دور

ان حضرات نے اگلے دور کے لیے جو جماعت تیار فرمائی، اس کے بنیادی ارکان ان حضرات ثلاثہ کے جانشین اور خلفائے اجل ہیں۔ جن میں ممتاز ترین حضرات، قطب عالم حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، مجاہدِ اعظم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ اسیر مالٹا، قطب الارشاد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہم اللہ ہیں۔ ان میں حضرت عالی رائے پوریؒ اور حضرت شیخ الہندؒ قرآنی تعلیمات کو اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ بستی بستی گاؤں گاؤں پھیلانے میں خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔ حضرت عالی رائے پوریؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کا باہمی تعلق تو ایسا تھا گویا ''یک جان دو قالب'' ہیں۔ اور پھر ان دونوں حضرات کا تعلق حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر وعمل سے انتہائی گہرا تھا، چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اُسلوبِ تفسیر کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا

www.rahimia.org

ترجمۂ قرآن پاک مکمل کیا اور حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالہ سے بلند کلمات ارشاد فرمائے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو ''حجۃ اللہ علی العالمین'' کے لقب سے یاد کیا۔ اور ان کے اسلوبِ تفسیر کے حوالہ سے تحریر فرمایا:

''حضرت مولانا شاہ ولی اللہ اور مولانا شاہ رفیع الدین اور مولانا شاہ عبدالقادر قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کے تراجم کو جو غور سے دیکھا تو یہ امر تو بے تامل معلوم ہو گیا کہ اگر یہ مقدسین اکابر قرآن شریف کی اس ضروری خدمات کو انجام نہ دے جاتے تو اس شدتِ ضرورت کے وقت میں ترجمہ کرنا بہت دُشوار ہوتا، علماء کو صحیح اور معتبر ترجمہ کرنے کے لیے متعدد تفاسیر کا مطالعہ کرنا پڑتا اور بہت ہی فکر کرنا ہوتا اور ان دقتوں کے بعد بھی شاید ایسا ترجمہ نہ کر سکتے جیسا اب کر سکتے ہیں ...حضرت شاہ ولی اللہؒ کو دیکھئے کہ اس بے نظیر علمی و عملی کمالات پر جو انہوں نے اپنے اوپر حق سبحانہٗ تعالیٰ کے انعامات متعدد رسالوں میں بیان فرمائے، ان انعاماتِ عظیمہ میں یہ ترجمہ مسمّٰی بفتح الرحمٰن بھی داخل ہے۔ اور عاجز نے اپنے بعض مرحوم بزرگواروں سے سنا ہے کہ مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ جب موضح القرآن لکھ چکے تو فارسی کا ایک شعر تھوڑا سا تصرف کر کے اس طرح پڑھتے تھے:

روزِ قیامت ہر کسے با خویش دارد نامہ   من نیز حاضر می شوم تفسیر قرآن در بغل

اس سے ان حضراتِ مرحومین کا کمالِ علم و تدین تو معلوم ہوتا ہی ہے، اسی کے ساتھ قرآن شریف کے صحیح تراجم کی عظمت اور ضرورت بھی ظاہر ہوتی ہے، **فجزاهم الله عنا و عن جميع المسلمين و افضل الجزاء**''۔(23)

اسی طرح قطب عالم شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کا تعلق بھی حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و افکار سے بہت گہرا تھا، چنانچہ باوجود بیماری اور تکلیف کے آپ کو حجۃ اللہ البالغہ کے مضامین کو سننے اور پڑھنے کا اشتیاق بڑی شدت سے رہا، آپ کے بارے میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی لکھتے ہیں:

''حکیم صاحب نے اشراق کے وقت ''حجۃ اللہ البالغہ'' سنانے کا معمول بنالیا، حضرت (عالی رائے پوریؒ) بڑے شوق سے سنتے اور بے اختیار سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے ہوئے بعض دفعہ جوش میں اُٹھ بیٹھا کرتے، کامل تین گھنٹے آپ کتاب سنتے اور پتہ بھی نہ چلتا کہ آپ بیمار ہوئے تھے اور ضعف ہے''۔(24)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کا تعلق حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفہ اور ان کی تعلیمات کے ساتھ بڑا گہرا تھا۔ چنانچہ ہر دو حضرات نے شاہ صاحبؒ کے فکر و فلسفہ کی اساس پر قرآنی تعلیمات کے پھیلاؤ کے لیے جدوجہد اور کوشش کی۔

## قرآنی تعلیم کے پھیلاؤ کی حکمت عملی

قطب عالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ایسے حضرات نے باہم

www.rahimia.org

مل کر اُسلوبِ ولی اللٰہی کی اساس پر قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کی جو حکمت علمی مرتب کی تھی اس کے کئی پہلو ہیں۔ اور ہر پہلو اس حوالے سے بڑا جامع نظر آتا ہے کہ اس کے نتیجہ کے طور پر حقیقی معنوں میں قرآنی تعلیمات کا پھیلاؤ ہوا، اور اغیار کے فکری اور عملی کردار کا توڑ سامنے آیا۔ مسلمانوں کے قلوب میں قرآن کے عالمی نظریہ پر یقینِ کامل اور اعتمادِ واثق پیدا ہوا۔ اور قرآنی نظریہ کے حوالے سے تربیت یافتہ افراد کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی، جو ہر قسم کے مادی مفاد اور ذاتی لالچ سے مبرا ہو کر خالص قومی مفاد، اجتماعی جذبہ اور ملی تقاضوں کے مطابق کام کرتی ہوئی قربانی دیتی ہے۔ اور یوں اگلی نسلوں کی جانب قرآنی علوم کو صحیح تناظر میں منتقل کرنے والی مخلص جماعت اور قیادت سامنے آتی ہے۔

## حکمت عملی کا ایک پہلو: مکاتیبِ قرآنیہ کا قیام

قرآنی تعلیم کے حوالے سے ان حضرات کی حکمت عملی کا ایک پہلو یہ تھا کہ غلامی کے زمانہ کے سامراجی نظریہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان بھر میں قرآنی تعلیم کے ابتدائی مکاتب جابجا قائم کیے جائیں۔ اس طرح ہر بستی کے ہر گھر میں قرآنی تعلیم کچھ اس طرح پھیلا دی جائے کہ جسے ان کے دلوں سے نکال باہر کرنا ممکن نہ ہو۔ اور سیاسی حوالے سے ہونے والے زوال کے اثرات ان کی فکری زندگی پر مرتب نہ ہوں۔ اس لیے کہ سیاسی زوال کے دور میں اگر کسی قوم کا اپنے فکر ونظریہ پر کامل اعتماد قائم رہے، تو وہ آگے چل کر کسی وقت بھی اپنے اندر ایک اعلیٰ تنظیم پیدا کر کے سیاسی نظام بنا سکتی ہے۔ لیکن اگر سیاسی زوال کے ساتھ فکری افلاس بھی پیدا ہو جائے، اور اپنے فکر ونظریہ پر اعتماد نہ رہے، تو ایسی صورت میں قوم کا دوبارہ ابھرنا ممکن نہیں ہوتا۔(25) اس سوچ کے پیش نظر ان حضرات نے ''مکاتب تعلیم قرآنیہ'' کی ایک وسیع تحریک ملک بھر میں جاری فرمائی، ہر ہر بستی اور محلّہ میں چھوٹے مکتب قائم کیے، جس میں ''نورانی قاعدہ'' جیسا عام فہم قاعدہ پڑھا کر قرآنی الفاظ کی صحت اور تلفظ کی صحیح ادائیگی کو عام کیا گیا، اور دین اسلام کے بنیادی ضروری مسائل یاد کرائے گئے، اور ان کی عملی مشق کے ذریعہ نوعمری میں ہی دینی حوالے سے پختگی پیدا کر دی گئی، بچپن میں ہی دل و دماغ پر قرآنی تعلیم کی ایسی چھاپ لگا دی جاتی کہ بڑے ہونے پر وہ جس ماحول میں بھی جائے، اس کا دین اسلام کے بنیادی قرآنی نظریہ کے ساتھ محبت اور شیفتگی کا تعلق برقرار رہے۔(26) چنانچہ اس حوالے سے ہندوستان بھر میں مکاتب قرآنیہ کا جال پھیلا دیا گیا، اس سارے عمل کی نگرانی اور سرپرستی براہِ راست حضرت اقدس عالی رائے پوریؒ نے فرمائی، قرآنِ حکیم سے محبت وتعلق، اور اس کی تعلیمات کو عام کرنے کا جذبہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں جس وسیع پیمانہ پر قرآنی تعلیم کو عام کرنے میں آپ نے جدو جہد فرمائی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت شیخ الہندؒ ''مسدس مالٹا'' (27) میں فرماتے ہیں:

چشمۂ فضل و معدن احسان     کاشف رمز علّم القرآن

محمل صدق قوم فخرِ زماں خیرکم من تعلّم القرآن

زینت زیبِ الفِ ثانی مرد شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

ایک اور مسدس میں اس کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

ہوئے عثمان جامع قرآن دِہ بدہ تم تھے قاسم فرقان

ان حضرات کی حکمت عملی کے اس پہلو کا سب سے روشن رُخ یہ ہے کہ اس طرح ہندوستان بھر کے ہر شہر، محلّہ اور بستی میں مکاتب قرآنیہ قائم کیے گئے، اور اس کے ذریعے سے قرآنی تعلیم پر اعتماد اور پختگی پیدا ہوئی۔ اور دیگر افکار اور نظریات سے مرعوبیت کی بجائے آگے چل کر عام لوگوں میں آزادی وحریت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور قرآنی تعلیم کا عمومی پھیلاؤ سامنے آیا۔

## قرآنی تعلیم کے پھیلاؤ کی حکمت عملی کا دوسرا پہلو

ان حضرات کی قرآنی تعلیمات کے پھیلاؤ کے لیے بنائی گئی حکمت عملی کا دوسرا پہلو انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ قدیم طرزِ تعلیم کے ذریعہ جو افراد دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں، ان میں گو ایک درجہ میں قرآنی تعلیم اور اس کے نظریہ سے محبت اور شیفتگی تو پیدا ہوجاتی ہے، اور ایک درجہ میں دین اسلام پر اعتماد اور اس کی عظمت کا نقش بھی دلوں میں پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن چند ایک ذی استعداد اور سمجھدار علماء کو چھوڑ کر عمومی طور پر افراد کی جو کھیپ تیار ہورہی ہے، وہ زوال کے دور میں کام کرنے کی قرآنی حکمت عملی اور اس کی سیاسی واقتصادی سوچ سے عموماً نا آشنا ہے، اسی طرح دورِ جدید میں تعلیم یافتہ طبقے کو دین اسلام کی عالمگیر اور آفاقی حکمت سے آگاہ کرنے کے واضح شعور میں بتدریج کمی ہوتی جارہی ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ افراد اسلام کے دورِ عروج میں لکھی گئی تفسیروں اور کتابوں کے مطالعہ میں منہمک رہنے کی وجہ سے دورِ زوال کے معروضی تقاضوں سے قطعاً نا آشنا ہوتے جاتے ہیں۔ دورِ زوال میں آزادی وحریت کے حصول اور اسلام کے حوالے سے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تشکیلِ نو کے جو مسائل اور تقاضے ابھر رہے ہیں۔ ان کا صحیح ادراک عمومی طور پر قدیم تعلیم یافتہ طبقہ میں نہیں ہوتا۔ اس لیے قرآنی علوم کے حوالے سے ان کی تکمیل کے لیے مزید تعلیم وتربیت کی ضرورت واضح طور پر سامنے آئی۔

دوسری طرف جدید تعلیم نے جہاں ہندوستان کی نوجوان نسل کو مغربی تہذیب وتمدن اور اس کی سیاست اور معیشت کے نئے زاویے اور یورپین علوم وحکمت تو کسی درجہ میں سکھادیئے۔ لیکن اسے قرآنِ حکیم کے انسانیت دوست عالمی فکر اور خدمت انسانیت پر مبنی نظریہ سے نا آشنا رکھا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے خطے کی رواداری پر مبنی وہ قومی روایات جن پر ہر معاشرہ اپنی سیاست اور معیشت کی بنیاد رکھتا ہے، اس سے نوجوان نسل کو بے بہرہ کردیا۔ یعنی یورپین ممالک تو اپنی قومی روایات اور تاریخ وثقافت پر مبنی سماجی رسوم واقدار کو اپنی جدید سیاسی زندگی میں پوری پوری

www.rahimia.org

اہمیت دے کر اپنے معاشرہ کی تشکیلِ نو کا کام سرانجام دیں۔اور ہندوستان کی نئی نسل ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ قومی سیاسی روایات کو نظر انداز کرے اور سامراجی ممالک کی سرمایہ پرستانہ سوچ اور نظریہ کی گرویدہ ہوجائے!؟ اس طرح ہندوستان میں دو الگ الگ ایسے طبقے جدید و قدیم تعلیم کے حوالے سے پیدا ہونا شروع ہوگئے، جن کا نقصان قومی سطح پر ظاہر ہونے لگا۔

ایسے ماحول میں اس بات کی ضرورت تھی کہ قدیم و جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ایسے نہج پر دینی وقومی تعلیم وتربیت کا بندو بست کیا جائے، جس میں قرآنِ حکیم کا انسانیت دوست حکیمانہ اسلوب اور اس کا عالمی سماج قائم کرنے کا آفاقی نظریہ پڑھے لکھے طبقہ کے سامنے آئے۔ یہ کام اپنی تمام تر وسعت اور اہمیت کے باوجود بڑی نزاکت کا حامل تھا۔ وہ اس طرح پر کہ اس کام میں ایک طرف یہ ضروری تھا کہ قرآنی انقلاب کے دنیا میں برپا ہونے سے لے کر آج تک تقریباً تیرہ سو سال کے علوم وافکار کی بنیادی اور اساسی روح اور آفاقی حکمت کو پیش نظر رکھا جائے یعنی گذشتہ دور کے تفسیری، حدیثی اور فقہی ذخیرہ کی اساسیت اور اس کی مربوط فلاسفی اور حکمت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوا۔تو دوسری طرف دورِ زوال کے حقیقی اسباب معلوم کرنا۔ جدید دور میں معروضی تقاضوں کے پیش نظر سیاسی نتائج کے حصول کی حکمت عملی کی صلاحیت اور استعداد کا پیدا کرنا بھی انتہائی ضروری ہوا۔

بالفاظِ دیگر قرآنِ حکیم کی آفاقی روح کی اساس پر قائم قدیم علوم ومعارف کے بنیادی اثاثہ سے استفادہ کرتے ہوئے، دورِ جدید کے تقاضوں سے بخوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک مربوط نظامِ فکر وعمل قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تاکہ افراد کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوسکے، جو ایک طرف اپنے قرآنی نظریہ کے حوالے سے کسی قسم کی مرعوبیت کا شکار نہ ہو، بلکہ اس کی آفاقی حکمت پر مکمل عبور اور گرفت رکھتی ہو، اور دوسری طرف معروضی حالات کے تناظر میں قرآنی سیاست کی حکمت عملی سے بہرہ ور ہو۔

## جمعیت الانصار کا قیام اور قرآنی علوم کے پھیلاؤ کے لیے اس کے مقاصد

جدید اور قدیم تعلیم یافتہ حضرات کی قرآنی علوم و معارف کے حوالے سے بلند تر تربیت کے حوالے سے ان اکابرین ثلاثہ (یعنی حضرت اقدس رائے پوریؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت سہارنپوریؒ) نے ایک وسیع تر نظام قائم کیا اور حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قائم کردہ فکر وعمل کی اساس پر ''جمعیۃ الانصار'' کے نام سے اس عظیم کام کا آغاز فرمایا۔ چنانچہ ان حضرات نے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو سندھ سے بلا کر اس عظیم الشان کام کی ذمہ داری سپرد کی، حضرت سندھیؒ اس سے پہلے سندھ میں دار العلوم دیوبند کی ایک شاخ، مدرسہ ''دار الرشاد'' پیر جھنڈا میں کام کررہے تھے، یہ ادارہ آپ نے ان حضرات اکابرین کے مشورہ سے ولی اللہی اسلوب پر تعلیم وتربیت دینے کے لیے شوال ۱۳۱۹ھ (1902ء) میں قائم فرمایا تھا۔ چنانچہ سات سال تک سندھ میں ماحول بنانے اور ایک قومی مرکزیت قائم کرنے کے بعد حضرت سندھیؒ کو دیوبند بلا لیا گیا تھا۔اور اس سلسلہ میں حضرت شیخ الہندؒ نے باقاعدہ سندھ کا سفر

کیا، اور وہاں کے ماحول کا جائزہ لے کر انہیں دیوبند آنے کے لیے فرمایا، چنانچہ حضرت سندھیؒ لکھتے ہیں:

**"ولما جاء شیخنا الی "دار الرشاد" اجتمع کثیر من الشیوخ الراشدیة لملاقاته فرجع الشیخ راضیا عنه، و شرعنا فی تنظیم علماء السند فی جمعیة السواد الاعظم وسعیٰ فی ذالک الشیخ محمد صادق السندی سعیا بلیغا وبعد ما صار المتخرجون من "دار الرشاد" قادرین علی ادارتها تحت رعایة الامام ابی التراب، امرنی شیخنا بالاقامة فی دار العلوم من سنة ۱۳۲۷ هجری". (28)**

''جب ہمارے استاذ (حضرت شیخ الہندؒ) سندھ میں دارالرشاد (پیر جھنڈا) تشریف لائے تو راشدیہ قادریہ سلسلہ کے بہت سے مشائخ آپ سے ملاقات کے لیے جمع ہوئے، تو ہمارے استاذ اُن سے بہت خوش ہوکر واپس لوٹے، اور ہم نے سندھ میں جمعیت السواد الاعظم کے حوالہ سے علماء کو منظم کرنا شروع کیا، اور اس سلسلہ میں مولانا محمد صادق سندھی نے بہت زیادہ جدجہد اور کوشش کی، اور جب دارالرشاد سے فارغ ہونے والے علماء میں امام ابوتراب کی نگرانی میں اس مرکز کو چلانے کی صلاحیت واستعداد پیدا ہوگئی، تو حضرت شیخ الہندؒ نے مجھے رمضان ۱۳۲۷ھ سے دارالعلوم دیوبند میں قیام کا حکم فرمایا''۔

چنانچہ رمضان ۱۳۲۷ھ (1909ء) کے آخری عشرہ میں حضرت سندھیؒ اپنے تیار کردہ شاگرد حضرات (مولانا احمد علی لاہوریؒ وغیرہ) کے ساتھ دیوبند تشریف لائے، اور حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس کے چند روز بعد ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ بمطابق 12 اکتوبر 1909ء بعد نمازِ تراویح شب نو بجے ''جمعیۃ الانصار'' کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا، جس میں باقاعدہ طور پر اس تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔(29)

قرآنی تعلیمات کی نشر واشاعت اور اس کے پھیلاؤ کے حوالے سے جمعیۃ الانصار کے پیش نظر کیا مقاصد تھے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ ''جمعیۃ الانصار'' کے ''قواعد ومقاصد'' کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

''ابوالحسین عبیداللہ بن الاسلام السندھی مدرسہ عالیہ دیوبند اور جمعیۃ الانصار کے متعلق معلومات تازہ کرنے کی غرض سے عرض پرداز ہے کہ اہل علم کی نظر میں کوئی تعلیم گاہ (اس وقت تک) اسلامی دارالعلوم یا مذہبی یونیورسٹی نہیں بن سکتی جب تک اس میں آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کو شائع کرنے والے معنوی خلفاء تیار کرنے کا پورا تہیہ (عزم) نہ کرلیا جائے، جن کی تفصیل میں شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں: **المعتنین بتعلیم الشرائع والقرآن والسنن والآمرین بالمعروف والناھین عن المنکر والذین یحصل بکلامھم نصرة الدین .....الی آخر** (ایسے افراد تیار کیے جائیں، جو قرآن وسنت اور شرائع دینیہ کی طرف بھرپور توجہ دیں، اور سماجی زندگی کے ہر دائرہ میں بھلائی کا حکم دینے

www.rahimia.org

والے ہوں ، اور برائی سے روکنے والے ہوں، اور وہ ایسے افراد ہوں جن کے طرز گفتگو سے دین کا غلبہ اور اس کی نصرت ہوتی ہو)۔(30)

ولی اللہی نقطۂ نظر سے دینی تعلیم کی بنیادی خصوصیت بیان کرنے کہ بعد حضرت سندھیؒ اس بات کی وضاحت فرماتے ہیں کہ اس دور میں جدید و قدیم تمام افراد کو قرآنی تعلیمات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے، اور ایسے افراد کی ضرورت ہے، جو تمام طبقات کو اپنے فکر و عمل سے مطمئن کر کے قرآنی تعلیم کو غالب کرنے کا جذبہ بیدار کریں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''اس وقت جب کہ عام افراد قوم میں مذہبی تعلیم سے علیحدہ رہنے کے نقصانات کا ہلکا سا احساس پیدا ہو چلا ہے، نہایت ضروری ہے کہ حاملین دار العلوم اپنے نظامات کو وسیع کر کے اس پیمانہ پر لانے کی کوشش کریں، جس سے تشنہ کام قوم کے تمام (جدید و قدیم) طبقات بآسانی سیراب ہو سکیں، لیکن اس قسم کی کوششوں سے پہلے اپنی منتشر قوت کا جمع کرنا اس درجہ ضروری ہے جیسے تعمیر مکان کے لیے اینٹ پتھر وغیرہ۔ جب تک سامان پورا مہیا نہ ہولے تو کسی تجویز میں کامیابی بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے۔

الحمدللہ اس مبارک تمہید کی ابتداء ''جمعیۃ الانصار'' کی صورت میں شمس الائمہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب صدر المدرسین اور فخر الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم (جو بانی قدس سرہٗ کے ظاہری و باطنی جانشین ہیں) کی متفقہ کوششوں سے نمودار ہوئی''۔(31)

## جمعیۃ الانصار کا تربیتی نظام اور ولی اللہی علوم و معارف کی تعلیم

قرآنی تعلیمات کے حوالے سے تربیتی نظام کا جو نقشہ ''جمعیۃ الانصار'' کے پیش نظر رہا ، وہ انتہائی بلند تر خصوصیات کا حامل تھا، چنانچہ ''جمعیۃ الانصار'' کے ایک انتہائی اعلیٰ سطحی اجلاس میں اس حوالے سے ایک بنیادی تربیتی نظام کے لیے چند دفعات منظور کی گئیں ، اس اجلاس کی کارروائی ضبط تحریر میں لاتے ہوئے، حضرت مولانا سندھیؒ رقم طراز ہیں:

''۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ (23 اپریل 1910ء) کو دیوبند میں جلسہ ''اجماع الانصار'' منعقد ہوا ، جس میں علاوہ تیس (30) اراکین جمعیت کے استاذ العلماء حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلہم العالی ، صاحبزادہ عالی جاہ مولانا مسعود احمد گنگوہی سلمہم اللہ تعالیٰ، حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری مدظلہم العالی ، جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم مدرسہ عالیہ، جناب مولانا حبیب الرحمٰن مددگار مہتمم مدرسہ عالیہ، سرپرستانِ جمعیۃ الانصار بھی شامل ہوئے ، اس میں قواعد نمبر 61 سے 66 تک منظور کرنے کی تحریک کرتے ہوئے بندہ ناظم نے کہا''۔(32)

حضرت سندھیؒ نے اس اجلاس میں مذکورہ دفعات کے حوالے سے ایک تمہیدی تقریر فرمائی، اور پھر درج ذیل دفعات منظوری کے لیے اجلاس کے سامنے پیش فرمائیں:

''الانصار کے قواعد آپ کے سامنے موجود ہیں، ان میں دفعہ نمبر (3) یعنی ''اس جمعیۃ الانصار کی غرض مدرسہ عالیہ دیوبند کے مقاصد کی تائید وحمایت اور اس کے پاک اثر کی ترویج واشاعت ہے''۔ایک امر مجمل ہے، میری رائے میں اس کی تفصیل کے لیے یہ موزوں ہوگا (کہ درجِ ذیل دفعات 61 تا 66 کا اضافہ کیا جائے)۔ دفعہ نمبر 61: جمعیۃ الانصار اپنے فرائض (یعنی مدرسہ کی تعلیمی ،انتظامی اور مالی ترقی) کی تعیین وتشخیص کے لیے پانچ شعبے قرار دیتی ہے:(الف) تکمیل التعلیم (ب) نظام التعلیم (ج) الارشاد (د) التالیف والاشاعۃ (و) جلسہ علمیہ۔دفعہ نمبر 62: جمعیۃ الانصار کے شعبہ ''تکمیل التعلیم'' کا فرض ہوگا کہ مدرسہ عالیہ دیوبند کے موجودہ نصاب کو ختم (مکمل) کرنے والے حضرات کے لیے جو درجہ تکمیل کھولا جاتا ہے،اس کی ضروریات مہیا کرے۔

تشریح دفعہ:(الف) درجہ تکمیل میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ العزیز کی تالیفات اور حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ کے خاندان کی کتابیں مثل حجۃ اللہ البالغہ، خیر کثیر اور عبقات از شاہ محمد اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ ،تکمیل الاذہان از شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اور حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مکتوبات پڑھائے جائیں گے۔

(ب) علم تفسیر وکلام وادب وغیرہ فنون کی اعلیٰ کتابیں بھی داخل درس ہوں گی۔

(ج) تقریر وتحریر کی خاص مشق کرائی جائے گی۔

(د) طریقہ تدریس وانتظام سکھلایا جائے گا۔

دفعہ نمبر 63:مدرسہ عالیہ دیوبندی کی سرپرستی جو مدرسہ قبول کرے اور اس کے نظامات تعلیمیہ اپنے ہاں نافذ کرے، اس کی اصلاح اور امداد جمعیۃ الانصار کے شعبہ ''جمعیۃ نظام التعلیم'' کا فرض ہوگا۔

دفعہ نمبر 64: ''جمعیۃ الارشاد'' کی ذمہ داری ایسے افراد تیار کرنا قرار دیا گیا، جس میں ذکر، واعظ، اور تحریر وتقریر کا ملکہ رکھنے والے حضرات کی تعلیم وتربیت ہو۔

دفعہ نمبر 65: جمعیۃ الانصار کے شعبہ ''جمعیۃ التالیف والاشاعۃ''میں : الف: ائمہ متقدمین

ب: حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان یعنی شاہ عبد العزیز وشاہ عبدالقادر وشاہ رفیع الدین وشاہ محمد اسماعیل وشاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ج: مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد قدس اللہ اسرارہما کی تالیفات وتصنیفات کی حفاظت (یعنی کتب خانہ مدرسہ عالیہ میں جمع کرنا) اور ان کی اشاعت بذریعہ طبع ونسخ وترجمہ ہوگی۔

د: اور اسی منہاج پر جدید کتب و رسائل مختلف زبانوں میں تصنیف و شائع کرائے جائیں گے''۔

حضرت سندھی رحمۃ اللہ نے ''اجماع الانصار'' کے سامنے یہ دفعات منظوری کے لیے پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر کے آخر میں درج ذیل الفاظ فرمائے: ''یہ پانچ شعبے ہیں جو میری رائے میں دفعہ نمبر (3) کی تفصیل ہو سکتے ہیں، ان میں اچھی طرح غور فرمالیا جائے، اور اس کی منظوری دی جائے''۔اس کے بعد حضرت سندھیؒ اپنی تقریر پر شرکاء اجلاس کا ردِعمل بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اس تقریر کے ختم ہونے پر حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری اور جناب صاحبزادہ حکیم مسعود احمد صاحب نے ان خیالات پر تحسین و آفریں فرمائی، اور جمعیۃ کے ساتھ پوری ہمدردی اور تعاون کا اظہار فرمایا'.....آخر میں تمام شرکاء اجلاس نے متفقہ طور پر ان دفعات مذکورہ بالا کی منظوری دی''۔(33)

''اجماع الانصار'' کے اجلاس میں منظور کردہ ان دفعات کی روشنی میں جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ اس طرح جمعیۃ الانصار نے قرآنی تعلیمات کی آفاقیت ، وسعت اور اس کے حکیمانہ اسلوب کو سمجھنے کے لیے ولی اللہی علوم و افکار کی اساس پر دینی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ اہتمام کیا۔اور دورِ زوال میں مسلمانوں کو کس رخ پر کام کرنا چاہئے۔اس کو معلوم کرنے کے لیے زوال کے دور میں کام کرنے والے محققین علماء خانوادۂ ولی اللہی کی کتابوں کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کا باقاعدہ عمل شروع کیا۔تا کہ اس دور کے مسائل اور ان کے حل کرنے کے حوالے سے مستند فکر و عمل سامنے رہے۔اور دورِ عروج میں مسلمانوں کے خوش کن حالات پڑھ پڑھ کر دین اسلام کے حوالے سے کسی خیالی خوش فہمی میں مبتلاء نہ رہیں بلکہ دورِ زوال میں دینی ذمہ داریوں کے حوالے سے زمینی حقائق سے آگاہ رہ سکیں۔اور دین کے غلبہ کی حکمت عملی صحیح نہج پر قائم کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔

## جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے تعلیم و تربیت کا نظام

ایک طرف تو ''جمعیۃ الانصار'' نے قرآنی علوم و معاف کو اس کی پوری روح کے ساتھ سمجھنے سمجھانے کے لیے ولی اللہی علوم و معارف کو پڑھنے پڑھانے کا عمل شروع کیا، تو دوسری طرف سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی دینی تعلیم و تربیت اور ان کو قرآنی علوم و معارف سے آگاہ کرنے ، اور اس حوالے سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو سمجھانے کے لیے درجِ ذیل قواعد و ضوابط طے کیے۔اس کی چند دفعات ملاحظہ ہوں:

''(ا) انگریزی مدارس ( گورنمنٹ سکول اور کالجوں ) میں مسلمان طلبہ کی ''مذہبی تعلیم'' اور ان کے دار الاقامہ (ہاسٹل) میں مسلمان طلبہ کی ''مذہبی تربیت'' کے لیے جمعیۃ الانصار کے ارکان و اعوان وقف ہوں گے''۔اس دفعہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت سندھیؒ فرماتے ہیں: ''اہل علم کو گورنمنٹ سکولوں اور کالجوں میں اگر چہ بعض امور خلاف طبع پیش آئیں، لیکن مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے لیے یہ تکالیف

برداشت کرنی چاہیے۔ ہمارا نصاب اس وقت فقط ارکان اسلام کی تعلیم ہوگی، جو عام مروجہ کتابوں مثل راہِ نجات، ومالا بد منہ کے ذریعہ دی جائے۔ ترجمہ قرآن شریف اور حدیث شریف کی کوئی مختصر کتاب اور علم الاخلاق کے چند اسباق بھی ساتھ شامل رہیں گے۔ہمیں قطعی امید ہے کہ ہماری جمعیت کے اراکین جب شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے رسائل پیش نظر رکھیں گے ۔۔۔۔جو ہمارے درجہ تکمیل کے نصاب میں داخل ہیں ۔۔۔تو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو اسلامی تعلیمات پر مطمئن کر دیں گے"۔(34)

دفعہ دوم (2) ہر ایک انگریزی مدرسہ (سکول و کالج) میں کم از کم 25 فیصد طلبہ جن کی دوسری زبان عربی ہو، ان کے لیے جمعیۃ انعامی وظائف جاری کرے اور انتظام میں سہولت پیدا کرنے کے لیے لائق استاذ بہم پہنچائے۔

دفعہ سوم (3) ایسے منتہی (گریجوائٹ یا انڈر گریجوائٹ) طلبہ جن کی دوسری زبان عربی ہو، ان کے لیے مدرسہ عالیہ دیوبند میں تعلیم دینیات کا خاص انتظام ہو، اور جمعیت 30 یا 40 ماہوار کے وظائف جاری کرے۔

دفعہ چہارم (4) جمعیۃ الانصار، مدرسہ عالیہ دیوبند میں دوسال کے لیے ایک ایسی جماعت (کے لیے داخلہ) کھولے گی، جو قرآن شریف پر مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دے سکے، اور جس قدر تالیفات اس وقت تک اس باب میں لکھی جاچکی ہیں، ان کے زیر مطالعہ ہوں۔ اس کے لیے دس سے بیس روپے تک وظیفہ دیا جائے گا۔(35)

ان دفعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "جمعیۃ الانصار" کے پیش نظر یہ بات تھی کہ ہمارے وہ نونہال اور نوجوان جو جدید تعلیم کے حصول کے لیے سکولوں اور کالجوں کا رخ کرتے ہیں، ان میں قرآنی علوم ومعارف کے بنیادی نظریات، عملی ذمہ داریوں اور ملی تقاضوں کا شعور بیدار کیا جائے اور انہیں قومی اور ملی ذمہ داریوں سے کچھ اس طرح آگاہ کردیا جائے، کہ وہ برطانوی حکومت کے سیاسی مقاصد کا آلہ کار بننے کی بجائے قومی مقاصد کے لیے اپنی عملی ذمہ داریاں نبھائیں، اور ان کی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ وہ جہاں نسلاً ہندوستانی اور نام کے مسلمان ہیں وہاں ان کا ذہن، فکر اور قلب و دماغ قرآنی علوم ومعارف اور اس کی عملی ذمہ داریوں سے بخوبی آشنا ہو جائے۔

اس کے لیے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی علمی اور عملی کاوشیں اپنے مربوط اور سائنٹیفک نظام فکر وعمل کی وجہ سے نوجوان تعلیم یافتہ اذہان وقلوب کو بڑی عمدگی سے اپیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ولی اللہی نظامِ فکر حیاتِ انسانی کے تمام سیاسی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کے متعلق ایسی بنیادی راہنمائی فراہم کرتا ہے، جو جدید دور کی سماجی تشکیلِ نو میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جمعیۃ الانصار کے پیش نظر یہ تھا کہ قرآنِ حکیم کے اس طرح کے مطالعہ اور اس میں غور وفکر کے ذریعہ سے تعلیم وتربیت کا اعلیٰ نظام قائم کیا جائے۔

www.rahimia.org

# قرآنی تعلیم کے پھیلاؤ کی حکمت عملی کا تیسرا پہلو

ایک طرف جدید وقدیم تعلیم حاصل کرنے والے افراد کے لیے ''جمعیۃ الانصار'' نے تعلیم وتربیت کا یہ نظام قائم کیا تو دوسری طرف قرآنی علوم ومعارف کے حوالے سے عوام الناس کی تربیت اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے عمومی جلسوں کا نظام قائم کیا گیا، جمعیۃ الانصار کے ابتدائی قواعد وضوابط میں اس کے لیے ''جلسہ علمیہ'' کی اصطلاح مقرر ہوئی، لیکن پھر اس جلسہ کا نام ''مؤتمر الانصار'' رکھا گیا، اس عمومی جلسہ میں مقررین کے لیے جو دائرہ کار طے کیا گیا، اسے ایک دفعہ کے ذریعہ متعین کر دیا گیا:

''دفعہ نمبر 53: جلسہ علمیہ میں فقط قرآن شریف اور حدیث شریف کے اسرار و لطائف بیان ہوا کریں گے''۔(36)

گویا فرقہ ورانہ مسائل اور تشدد پر مبنی مناظرانہ مباحث اور سطحی اور رسمی تقریروں کی بجائے قرآن وسنت کی حکمت، مقاصد اور ان کے اسرار و لطائف اس انداز میں بیان ہوں کہ سامعین کے قلوب میں قرآنی تعلیم کی عظمت اور محبت پیدا ہو، اور اس کے نتیجے میں جو ذمہ داریاں قرآنی تعلیمات کو ماننے والوں پر عائد ہوتی ہیں انہیں سمجھا جائے، اور اس کے لیے عملی کوشش کی جائے، اس طرح عوام میں قرآنِ حکیم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے اپنی قومی ذمہ داریوں اور ملی تقاضوں کا شعور بیدار کرنے کے لیے جلسہ عمومی کا انتظام کیا گیا۔

''مؤتمر الانصار'' کا پہلا جلسہ عام 17,16,15 اپریل 1911ء مطابق ۱۳۲۹ھ کو مراد آباد میں ہوا، اور دوسرا جلسہ 8,7,6 اپریل 1912ء بمطابق ربیع الثانی ۱۳۳۰ کو میرٹھ میں منعقد ہوا۔ اور تیسرا جلسہ عام 10,9 اگست 1913ء شعبان ۱۳۳۱ھ کو ''شملہ'' میں رکھا گیا، ان تمام اجلاس ہائے عام میں عام مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش سے شرکت کی اور ان میں عوامی تحریک پیدا ہوئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں اتنے بڑے اجتماعات منعقد کرنے کی یہ اولین کاوشیں تھیں، جو انتہائی کامیاب رہیں، اس تحریک کے نتیجہ میں ایک تو جلسہ عام کے ذریعہ اجتماعیت پیدا کرنے کا رواج قائم ہوا، دوسرے یہ اجتماعات صاحبِ دل حضرات کے مواعظ اور خطبات سے مسلمانوں کے قلوب میں قرآن وسنت سے سچی محبت، اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ بنے اور یوں عملی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اجتماعی طاقت کا اظہار ہوا۔

# قومی سطح پر ''جمعیۃ الانصار'' کا کردار

قومی سطح پر اس اجتماعی طاقت سے فائدہ اٹھانے کا موقع اس وقت آیا، جب بلقانی ریاستوں نے برطانوی اور روسی سازش سے 1912ء میں ترکوں پر حملہ کر دیا۔ اور جنگ بلقان نے خلافت عثمانیہ کے حصہ بخرے کرنے کے لیے تباہی و بربادی کا بازار گرم کر دیا۔ تو دار العلوم اور جمعیۃ الانصار نے ترکوں کی امداد واعانت کے لیے سرتوڑ کوشش کی،

www.rahimia.org

اور اس سلسلہ میں ''مؤتمر الانصار'' کی اجتماعیت سے بھر پور فائدہ اٹھایا گیا۔ چنانچہ جمعیۃ الانصار کے تمام شعبے اس سلسلہ میں سرگرمِ عمل ہوگئے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی تحریر فرماتے ہیں:

''بلقان کے خونخوار اور طرابلس کے سنگین واقعہ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے دل و دماغ پر نہایت عجیب مگر بے چین کن اثر ڈالا، چنانچہ اس وقت حسب طریقہ استاذِ اکبر حضرت مولانا محمد قاسم (نانوتویؒ) صاحب (در جنگ روس) حضرت مولانا نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی، فتاویٰ چھپوائے، مدرسہ دیوبند کو بند کر دیا، طلبہ کے وفود بھجوائے، خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے، چندے دیئے اور ہر طرح سے مدد کی''۔(37)

چنانچہ جمعیۃ الانصار کے زیرِ نگرانی ''ہلالِ احمر'' کی شاخیں ہندوستان بھر میں قائم کرائی گئیں، اور ہر جگہ سے ترکوں کی مالی اعانت کے لیے چندے کی تحریک کی گئی۔ اور وفود کے ذریعے سے مسلمانوں کے قومی اور ملی جذبات کو ایک راہِ عمل پر چلانے کی سعی و کاوش کی گئی، اس سلسلہ میں پورے ہندوستان میں گویا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک قومی اور ملی تحریک پیدا کر دی گئی، چنانچہ امامِ انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''دار العلوم دیوبند کا فتویٰ (جو گزشتہ ''القاسم'' میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں) اب تک مختلف طور پر ایک لاکھ سے زیادہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے، دار العلوم اور اس کے متعلق مدارس کے مدرسین اور طلبہ کے وفود قصبات اور دیہات ہند کے تمام اطراف میں دورہ کر کے رؤساء، علماء، مشائخ اور عوام کو متوجہ کرتے رہے ہیں، محض ان لوگوں کے مواعظ اور اس جماعت کی جدوجہد سے ایک بڑی مقدار جس کا تخمینہ تین لاکھ روپیہ سے کم نہیں، مقامی انجمنوں اور اخبارات کے ذریعے سے ترکوں کے لیے بھیجا گیا ہے، اس کے علاوہ اراکین دار العلوم کی معرفت بھی پچھتر ہزار سے زیادہ جمع ہو چکا ہے، اور یہ روپیہ عموماً نیشنل بنک کے توسط سے پریذیڈنٹ ہلالِ احمر قسطنطنیہ کے نام سے پہنچایا گیا۔

یہاں اس قدر ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ضلع سہارنپور میں مولانا خلیل احمد صاحب صدر انجمن ہلالِ احمر سہارن پور حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری و مولانا اشرف علی تھانوی و مولانا حکیم مسعود احمد گنگوہی و مولانا حکیم محمد احمد رام پوری کے مساعی جمیلہ سے جس قدر روپیہ جمع ہوا، غرباء اور متوسط الحال لوگوں سے اتنی رقوم جمع کر لینا آسان نہیں''۔(38)

اس طرح جمعیۃ الانصار نے قرآنی علوم و معارف کی محض علمی و فکری تربیت کا ہی نظم نہیں قائم کیا، بلکہ بڑی حکمت عملی کے ساتھ برطانوی تسلط کے خلاف ترکوں کی امداد اور تعاون کرتے ہوئے قومی جدوجہد کے عملی رخ پر بھی کام سرانجام دیا۔

## اس حکمت عملی کا ایک اہم پہلو؛ شیخ الہندؒ کا ترجمۂ قرآنِ حکیم

جمعیۃ الانصار کی ساری علمی و عملی جدوجہد کی بنیاد اس پر تھی کہ قرآنِ حکیم کی جامع تعلیمات سے نوجوانوں کو آگاہ کیا جائے۔ اور اس عظیم الشان کام کے لیے ضرورت تھی ایک ایسے عام فہم ترجمۂ قرآنِ حکیم کی، جس میں ایک طرف قرآنِ کریم کے حکیمانہ طرزِ فکر اور اس کی جامعیت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہو، تو دوسری طرف وہ ایسے عام فہم اسلوب میں ہو جس میں اپنے دور کے محاورات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔ چنانچہ یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآنِ حکیم کی پُر از حکمت آیات مبارکہ کا اس دور کی اردو زبان میں پورا پورا اور صحیح ترجمہ کیا جائے۔ لیکن یہ کام وہ فرد کر سکتا ہے، جو ایک طرف رائج اردو کے اسلوب اور اس کے محاورات سے پوری آگاہی رکھتا ہو، اور اس حوالے سے اہل زبان ہو، اور دوسری طرف قرآنِ حکیم کی نصوص میں موجود فصاحت و بلاغت اور اس کے بلند اسلوب سے آگاہ ہو، نیز قرآن حکیم کی آفاقی حکمت و سیاست کا بھرپور شعور رکھتا ہو۔ اس کام کے لیے سب کی نظریں شمس الائمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ کی جانب تھیں۔ باوجود اس کے کہ حضرت شیخ الہند کے بعض شاگردوں (حضرت تھانوی اور حضرت میرٹھی) نے قرآن کریم کے عام فہم اردو تراجم کر دیئے تھے، اور جو ایک درجہ میں قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے، لیکن ایک ایسے ترجمہ قرآن کی بہرحال ضرورت موجود تھی، جس میں حکمت سے بھرپور اردو اسلوب میں قرآنی آیات کے پُر از حکمت مطالب کا اظہار کیا گیا ہو۔ گویا انسانی سوسائٹی کے تمام انفرادی اور اجتماعی دائروں، سیاسی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں اور ملکی و بین الاقوامی نظاموں کے متعلق قرآنِ حکیم جو بنیادی رہنمائی فراہم کرتا ہے، اور اس حوالے سے آفاقی فلاسفی اور عالمی نظام کے احکام بیان کرتا ہے، قرآنِ حکیم کے جامع ترجمہ کے ذریعہ اس کے حکیمانہ فکر و عمل کا کلی اظہار سامنے آجائے، یعنی قرآنی نصوص اپنے حکیمانہ اسلوب میں انسانی زندگی کے تمام دائروں کے حوالے سے جس طرح مفہومِ کلی اور عمومیت رکھتی ہیں، اس طرح ترجمہ میں اس مفہوم کلی کا لحاظ رکھا جانا بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

## اس ترجمۂ قرآن حکیم کی اہمیت؛ حضرت رائے پوریؒ کی نظر میں

چنانچہ اس ضرورت کے پیش نظر ''عارف حکمت یمانی'' حضرت اقدس شاہ عبد الرحیم رائے پوری قدس سرہ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ سے انتہائی اصرار کے ساتھ قرآنِ حکیم کا ترجمہ کرنے کے لیے فرمایا۔ اسی طرح امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ سے قرآنی حکمت و سیاست سیکھ کر اسے اپنے دل و دماغ میں رچا بسا لیا تھا، اور علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ جنہوں نے قرآنی نصوص کے بلیغانہ اسلوب اور فصاحت و بلاغت کے معجزانہ طریق کو شیخ الہندؒ سے سیکھ کر پوری طرح جذب کیا تھا۔ ان ہر دو حضرات نے بھی حضرت شیخ الہند سے ترجمہ قرآنِ حکیم کی درخواست کی۔ اس کے علاوہ وہ تمام مصالح بھی آپ کے پیش نظر تھیں جو گزشتہ

گزری ہیں، ان تمام وجوہات کی بناء پر حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ قرآن کا آغاز فرمایا، چنانچہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب ''حیاتِ شیخ الہندؒ'' میں لکھتے ہیں:

''بعض اہل علم کی استدعا اور بہت سی مصالح سے اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ کی نہایت آرزو دیکھ کر حضرت مولانا (شیخ الہندؒ) کو قرآنِ مجید کا ترجمہ کرنے کا خیال ہوا''۔(39)

حضرت شیخ الہندؒ نے اس شرط پر یہ کام شروع فرمایا کہ حضرت اقدس رائے پوری اس پر نظر ثانی فرمایا کریں۔ حضرت رائے پوری نے اسے منظور فرمایا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ جتنا ترجمہ قرآن لکھتے حضرت اقدس رائے پوری کے پاس ''رائے پور'' لے آتے یا حضرت رائے پوری دیوبند آجاتے تو ایسے موقعوں پر حضرت شیخ الہند اپنا لکھا ہوا ترجمہ آپ کو سناتے تھے، یوں نظر ثانی کا کام ہوتا رہا۔ اس طرح تقریباً ایک تہائی قرآن کا ترجمہ مکمل ہوا، چنانچہ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

''ہمیں حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہ کی عظمت شان کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آپ ترجمہ قرآن تحریر کر کے رائے پور لے جایا کرتے تھے، اور ترجمہ حضرت رائے پوری کو سناتے تھے، اس وقت ہم متنبہ ہوئے کہ حضرت رائے پوری کا کتنا اونچا مقام ہے، جو ان کی تواضع اور انکساری کی وجہ سے اب تک ہم سے پوشیدہ تھا''۔(40)

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے چونکہ حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی کے قدیم اردو ترجمہ ''موضح القرآن'' کو جدید اردو کے حکیمانہ اسلوب میں ڈھالا ہے۔ اس لیے حضرت رائے پوری کی مجلس میں اپنا ترجمہ سناتے وقت حضرت شیخ الہند اس کی وضاحت فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کے قدیم جملوں کی جگہ پر، اختیار کردہ اردو جملوں اور محاورات کا انتخاب کس بناء پر کیا گیا، چنانچہ اردو جملوں کے انتخاب میں حکیمانہ وسعت اور جامعیت کو پیش نظر رکھا جاتا تھا، امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ ترجمہ شیخ الہندؒ کی تاریخی حیثیت، حکیمانہ اسلوب اور اس کے تحریری پس منظر کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''شاہ ولی اللہ صاحب نے قرآنِ حکیم کا فارسی میں ترجمہ کیا، جب کہ ہندوستانی سلطنت ختم ہونے پر تھی، یہ ترجمہ عجمی زبانوں میں جتنے ترجمے ہوئے، ان سب میں بے نظیر تھا......اس کے بعد شاہ صاحب کے بیٹوں نے اردو میں ترجمے شروع کیے، اس لیے کہ زمانہ بدل گیا تھا.....ان میں سب سے اچھا ترجمہ ''موضح القرآن'' شاہ عبد القادر دہلویؒ کا ہے۔ اس کی اردو آج بعض حیثیتوں سے متروک ہو رہی تھی، میرے استاذ حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے آج کے دور کے موافق اس کی اردو درست کر دی،...... خالی یہ ترجمہ پڑھنے سے جو مطلب سمجھ آتا ہے، وہ فارسی میں بھی نہیں آتا، اس لیے کہ اس میں جو حکمت کے کلمے ہیں، وہ ٹھیک ٹھیک ترجمہ کر دیئے گئے ہیں، اس لیے کہ حکمت کو حکیم ہی کا دماغ سمجھ سکتا ہے۔

www.rahimia.org

ہمیں اس ترجمہ کے چند اوراق (شیخ الہندؒ نے) دیوبند میں سنائے، اصل میں تو آپ حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری کو یہ ترجمہ سنا رہے تھے، اس طرح ہم کو بھی سننے کا شرف حاصل ہوگیا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سنانے میں لگا، جس میں آپ نے شاہ عبد القادر دہلویؒ کے ترجمہ میں تبدیلیاں کر کے بتائیں، اور بتایا کہ ان کی کیا ضرورت ہے"۔(41)

اس طرح "جمعیۃ الانصار" کے حضرات سرپرستان نے قرآنِ حکیم کا ایک ایسا عام فہم اردو ترجمہ تیار کیا، جو سلف صالحین کے اصول اور ولی اللہی اسلوب پر قرآنی علوم ومعارف کو عام کرنے میں اساسی اہمیت کا حامل قرار پایا۔ آج تمام اردو دنیا میں یہ ترجمہ اس حوالے سے معتبر اور مستند سمجھا جاتا ہے۔

## قرآنی تعلیم کے اثرات؛ تحریکِ آزادی وحریت کی شکل میں

حضرات اکابرین نے "مکاتب قرآنیہ" کے قیام اور "جمعیۃ الانصار" کے نظام کی صورت میں قرآنی علوم ومعارف کے پھیلاؤ کے لیے جو تحریکات برپا کیں تھیں، ان کا مقصد قطعاً یہ نہ تھا کہ رسمی طور پر قرآنِ کریم کی تعلیم کا انتظام ہوجائے، اور بے روح ادارے محض ظاہری طور پر کھڑے کر دیئے جائیں بلکہ اس تمام ترسعی وکاوش کا بنیادی اساسی مقصد یہ تھا کہ دورِ غلامی اور زمانۂ زوال میں قرآنی تعلیم کا لازمی تقاضہ یعنی ---تحریک آزادی وحریت --- کے حوالے سے نوجوانوں کو بیدار کیا جائے۔ ایک مسلمان جب قرآن پر اعتماد ویقین کا اظہار کرتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اغیار کی غلامی سے نجات حاصل کر کے پوری آزادی وحریت کے ساتھ اپنا نظام، اپنے انسانیت دوست نظریہ کے مطابق تشکیل دے سکے۔ اور یہ وہی سوچ ہے جس کا اظہار حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کیا تھا، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

**"یجب بذل الجھد علی اھل الآراء الکلیۃ فی اشاعۃ الحق و تمشیتہ و اخمال الباطل وصدہ فربما لم یمکن ذالک الا بمخاصمات او مقاتلات فیعد کل ذالک من افضل اعمال البر ". (42)**

" مفادِ عامہ کی سوچ رکھنے والوں پر یہ بات واجب ہے کہ وہ حق کے پھیلاؤ اور غلبہ کے لیے اور باطل کو مٹانے اور روکنے کے لیے جدوجہد اور کوشش کریں اور بسا اوقات یہ کام اُس وقت تک ممکن نہیں ہوتا، جب تک کہ فرسودہ نظام کو توڑنے کے لیے لڑائی اور مزاحمت (انقلاب) کا عمل اختیار نہ کیا جائے، ایسے زمانہ میں یہ کام کرنا نیکیوں کے تمام اعمال سے افضل ہوتا ہے"۔

شاہ صاحب کی اس عبارت کے تناظر میں یہ سمجھا گیا کہ یہ دورِ زوال ہے، اس لیے ذلت کی زندگی سے نکلنے کے لیے آزادی کے حصول کی جدوجہد فرائض قرآنیہ میں سے ہے۔ چونکہ اس دور میں آزادی کے حصول کی حکمت عملی

www.rahimia.org

خفیہ رکھنا ضروری تھا۔ اور ظاہری طور پر کام کرنے میں کئی مشکلات تھیں، اس لیے ایک مخصوص مدت تک یہ کام مخفی طور پر جاری رکھا گیا۔ اور ظاہری طور پر کام کے لیے راہ ہموار کی گئی۔

اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ مکاتب قرآنیہ قائم کرنے کی تحریک ہو، یا ''دار الرشاد'' پیر جھنڈا کا قیام ہو، جمعیۃ الانصار کا وسیع نظام ہو، یا آگے چل کر ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کا وسیع ترین نیٹ ورک ہو، یہ سب ''دار العلوم دیوبند'' کے مقاصد کو پھیلانے کی وہ ارتقائی صورتیں ہیں جو اپنے اپنے احوال و مقام پر بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ اور دار العلوم دیوبند وہ ادارہ ہے جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ نے اپنے دور میں جن مقاصد کے لیے قائم کیا تھا، اس کی وضاحت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اس طرح فرماتے ہیں:

''حضرت الاستاذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس مدرسہ کو محض درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کے لیے قائم نہیں کیا تھا، مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں 1857ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ 1857ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے''۔ (43)

قرآنی علوم و معارف کی تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس کا وہ نظام جو اِن حضرات نے قائم کیا، اس کا اساسی مقصد کیا تھا، اس نظام کے تیار کردہ اولین فرد حضرت شیخ الہندؒ کے نزدیک دار العلوم دیوبند کا مرکز 1857ء کی جنگ آزادی و جہادِ حریت کے تسلسل کے طور پر قائم کیا گیا تھا۔ اور یوں قرآنی علوم و معارف کا لازمی اثر جدوجہد آزادی کے حوالے سے متعین طور پر موجود تھا، چنانچہ ''جمعیۃ الانصار'' جیسی سرگرمیاں اس کی ارتقائی شکل کے طور پر منظّم کی گئی تھیں، اور پھر یہ نظریہ اور فکر و عمل صرف حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا ہی نہیں، تھا بلکہ حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہی کے تربیت یافتہ مخصوص خلفاء اور اوپر کی سطح کی مرکزی جماعت کے تمام حضرات کا یہی جذبہ تھا، چنانچہ امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''لان الامر (الجهاد) لم يكن مقصوراً على شيخنا فقط بل كان معه جماعة من اتباع مولانا محمد قاسم نانوتوى وطائفة من اتباع مولانا رشيد احمد مثل مولانا عبد الرحيم الرائى پورى ''. (44)

''ترجمہ: جہادِ حریت کا کام صرف ہمارے شیخ (حضرت شیخ الہندؒ) ہی نہیں کر رہے تھے، بلکہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تربیت یافتگان کی ایک جماعت اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے تربیت یافتہ خلفاء کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ تھی، جیسا کہ حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں''۔

اس طرح گویا حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے تربیت یافتہ حقیقی جانشین

www.rahimia.org

اور خلفاء، جہاد حریت کے معاملہ میں مکمل طور پر متفق اور یکجان تھے، چنانچہ حضرت رائے پوری، حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت سہارنپوریؒ تینوں اجل خلفاء جہاں اپنے عام مریدین سے ''بیعتِ سلوک'' لیتے تھے، وہاں مخصوص باصلاحیت اور منتخب اہل افراد سے ''بیعت جہاد وحریت'' بھی لیا کرتے تھے۔

## قرآنی تعلیمات کے اس اسلوب پر حضرت سندھیؒ کی تربیت

جمعیۃ الانصار کی تحریک نے ایسا ماحول تیار کیا، جس میں ایک طرف عام مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو منظّم کر کے ان میں قرآنی نظریہ کے حوالے سے پختگی اور اعتماد پیدا کیا، تو دوسری طرف مخصوص باصلاحیت و عالی استعداد حضرات کی بلند تربیت کا بھی اہتمام ہوا۔ چنانچہ دیگر حضرات کے علاوہ خود حضرت سندھیؒ (جو جمعیۃ الانصار کے روح رواں تھے) نے اس زمانہ میں اعلیٰ تربیت حاصل کی۔ چنانچہ آپ نے دیوبند کے سرپرست حضرات کے ماحول سے بہت کچھ سیکھا، اور اس حوالے سے آپ کے ذہن وفکر میں پختگی پیدا ہوئی۔ بالخصوص حضرات سرپرستان حضرت شیخ الہندؒ، حضرت رائے پوریؒ اور حضرت سہارنپوری سے براہِ راست آپ نے فیض حاصل کیا۔ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ولی اللہی علوم ومعارف کی کتابیں پڑھ کر، انہیں اچھی طرح ہضم کیا، اور اپنی روح کی گہرائیوں میں انہیں جذب کیا۔ چنانچہ حضرت سندھیؒ خود لکھتے ہیں:

**وکان من عمدة اعمال الجمعية المؤتمر العلمي الديني و تنظيم تكميل الشرعيات للطائفتين ممن تخرج من مدارس الدينية او من المكاتب العصرية و جمع النفقات لِ"الهلال الاحمر"، والتفاصيل مطبوعة في المجلات والمجلدات. مضيت على مثل تلك الاعمال بنحو اربعة من السنين، واخذت عن شيخنا في اثناء ذالک "حجة الاسلام" لشيخ السلام مولانا محمد قاسم النانوتوي واطرافا من "حجة الله البالغة" واطرافا من "موضح الفرقان" لشيخنا شيخ الهند. وفوق ذالک اني تعلمت في تلک الملازمة كيف يمكن الاتحاد مع جماعات من المسلمين المخالفين لطريقتنا في بعض شؤونهم و كيف يحصل الاتفاق مع الوطنيين من غير المسلمين وذالک اني كنت ابتليت بهم بأمر الشيخ و اراجعه في المشكلات، فيرشد رحمه الله خير ارشاد، وكان ارشادهٗ دائما مستنبطا من السنة الصحيحة المعروفة من النبي صلى الله عليه وسلم او من خلفاء الراشدين اما يحكيه عن شيخه شيخ الاسلام مولانا محمد قاسم او يكون استنباطا منه، وكان يصرح بذالک، فان استنباط شيخه كان اوثق عنده من استنباطه. فرأيت رأى العين ان جماعة المسلمين اذا لم يكن فيهم طائفة يقتدرون على استنباط الاحكام من**

www.rahimia.org

**الکتاب و السنة لایمکن الجری علی المذھب فی السیاسات، فانھا تتبدل کل یوم و تظھر فی آن واحد بمظاھر مختلفة، وتیقنت ان الاجتھاد المقید بالمذھب یشبه السیاسة الحربیة و القومیة علی اختلاف المدارج، و فیه خیر کثیر ان کان اکثر اھل ناحیة او مملکة متقیدین بھذا المذھب". (45)**

''جمعیۃ الانصار کے عمدہ ترین کاموں میں "**المؤتمر العلمی الدینی**" کا قیام تھا اور مدارسِ دینیہ اور جدید تعلیمی اداروں سے فارغ ہونے والے افراد کے لیے دینی اساس پر تنظیم قائم کرنا اور ''ہلالِ احمر'' کے زیرِ انتظام فنڈ زجمع کر کے ترکوں کی امداد کے لیے بھجوانا بھی تھا، اس کی تفصیلات اس دور کے رسائل اور کتابوں میں موجود ہے، اس طرح کے کام میں نے تقریباً چار سال تک کئے، (دیوبند کے) اس قیام کے دوران میں نے حضرت شیخ الہندؒ سے درجِ ذیل کتابیں پڑھیں: ''حجۃ الاسلام'' از مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حجۃ اللہ البالغہ (از شاہ ولی اللہ دہلویؒ) کے اہم مقامات، اور حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ ''موضح الفرقان'' کے اہم مقامات، مزید برآں یہ کہ اس ماحول میں رہ کر میں نے یہ سیکھا کہ بعض معاملات میں ہمارے طریقہ کے مخالف مسلمان جماعتوں سے سیاسی معاملات میں کیسے اتحاد ممکن ہے، اور یہ بات بھی سیکھی کہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ سیاسی اتحاد و اتفاق کیونکر ممکن ہے، یہ اس لیے کہ میں اپنے استاد (حضرت شیخ الہندؒ) کے حکم سے ان معاملات میں پڑتا تھا، اور جہاں کوئی مشکل پیش آتی، تو ان کی طرف رجوع کرتا تھا، آپ بہت عمدہ طریقہ سے رہنمائی فرماتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ سیاسی معاملات میں جو رہنمائی فرماتے تھے، وہ عام طور پر سنن نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفاء راشدین کے اقوال و افعال سے مستنبط ہوتی تھی، پھر یہ مستنبط شدہ قول آپ اپنے استاذ حضرت نانوتویؒ سے نقل کیا کرتے تھے، یا آپ کا اپنا استنباط ہوتا تھا، تو اس کی تصریح فرمادیا کرتے تھے، آپ کو اپنے استنباط سے زیادہ اپنے استاذ کے استنباط پر اعتماد ہوتا تھا، اس دور میں میں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمان جماعتوں کے ایسے لوگ جو کتاب وسنت سے احکام کو مستنبط کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، وہ سیاسی میدان میں مذہب کی تعلیمات پر چلنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے اور مجھے یہ اچھی طرح یقین ہوگیا کہ اجتہاد فی المذہب بہت حد تک قومی سیاست اور حربی حکمت عملی کی اجتہادی صلاحیت کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، باوجود اس کے کہ ان دونوں میں درجات کا بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، اور اس میں بڑی بھلائی کی بات ہے کہ کسی علاقہ اور مملکت کے اکثر لوگ ایسے مذہب کے پابند ہوں، (جو ان کی سیاسی ضرورت کو بھی پورا کرتا ہو)''۔

## امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے تفسیری اسلوب کا پس منظر

اس طرح حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ الہندؒ کی تعلیم اور دیوبند کے اونچے درجہ کے ماحول کی تربیت سے قرآنی علوم و معارف اور ان سے اخذ و استنباط کے بنیادی اصولوں کا مطالعہ مکمل کیا۔ اور اس حوالے سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادہ عالی مقام کی بیان کردہ قرآنی فلاسفی ، اس کے اصول ، اور ان کے تراجم قرآن کی گہرائی اور عملی زندگی میں ان کے انطباق اور اخذ و استنباط کو بڑی عمدگی سے اخذ کیا ۔ اور یوں حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند کے اس اونچے قرآنی ماحول کے مزاج میں ڈھلتے چلے گئے ۔ جو دنیا بھر میں اپنی وسعت ، گہرائی اور عملی زندگی کے حقائق سے نبردآزما ہونے کے حوالے سے ممتاز حیثیت کا حامل تھا، چنانچہ آپ کے مزاج میں بھی قرآنی علوم و معارف کی وسعت کو سمیٹنے ، اس کے عمق اور گہرائی کو جانچنے اور انسانی سوسائٹی میں اس کے عملی انطباق کا بلند ملکہ پیدا ہوگیا۔

۱۳۰۸ھ/ 1890ء میں آپ نے دیوبند میں قرآنی علوم کے جس مطالعہ کا آغاز فرمایا تھا، جمعیۃ الانصار کے سلسلہ میں دیوبند کے چار سالہ قیام میں اس مطالعہ کا بہت اہم پہلو مکمل ہو جاتا ہے۔ یوں گویا 23 سال تک حضرت شیخ الہندؒ کی رہنمائی اور دیوبند کے ماحول کی تربیت اور صحبت نے آپ میں قرآنی علوم و معارف کی اساسی حکمت ، اور اس حوالے سے اخذ و استنباط کی بنیادی صلاحیت کو نکھار کر رکھ دیا ۔ البتہ مطالعہ قرآن کا دوسرے پہلو یعنی انسانی سوسائٹی پر قرآن کے عملی انطباق کے لیے اس دور کی معروضی سیاست ، انسانی سماج کے بنیادی مسائل اور انسانیت دوست نتائج کے حصول کی بلند تر حکمت عملی کے حوالے سے جمعیۃ الانصار کا دور آپ کے لیے ابتدائی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، کہ اس نشانِ راہ پر آپ نے تادمِ حیات سفر جاری رکھا۔ اس دور میں آپ نے حضرت شیخ الہندؒ سے جو سیاسی اسلوب سمجھا، اس کی بنیاد پر ملکوں اور قوموں کا مطالعہ کیا، ان کے عملی تجربات کو جانچا اور پرکھا، نتائج اخذ کیے، اور اپنے فکر و عمل کو ایک ترقی یافتہ شکل دی اور اس پر جدوجہد کی ۔ یہی وجہ ہے کہ آئندہ چل کر حضرت سندھیؒ نے ہندوستان کے اونچے درجہ کی سیاست اور یہاں کے حقیقی مسائل کا ہی ادراک نہیں کیا، بلکہ عالمی سطح پر برطانوی سماج کے نظام فکر و عمل اور یورپین سیاست کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کیا، اور قرآنی نقطۂ نظر سے اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔

## حضرت سندھیؒ کے تفسیری اسلوب کی جامعیت

اس طرح قرآنی علوم و معارف کو دَور کے معروضی تقاضوں کے تناظر میں سمجھنے اور اس کے غلبہ کے لیے عملی نتائج کے حصول کے حوالے سے آپ کے سامنے ایک بلند افق روشن ہوگیا، یوں ایک ایسا جامع تفسیری اسلوب واضح ہو کر سامنے آتا ہے جو ایک طرف اصولِ تفسیر کے بنیادی اساسی اصولوں پر پورا اترتا ہے، تو دوسری طرف دورِ حاضر کے سیاسی ، معاشی ، تہذیبی اور تمدنی مسائل کے بارے میں ایک واضح اور بلند تر فکری اور عملی حل پیش کرتا ہے، حضرت

www.rahimia.org

سندھیؒ اپنے تفسیری اسلوب کے تخلیقی مراحل اور اس کے مکمل پس منظر کا حال خود بیان فرماتے ہیں:

''اب ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ پڑھا ہے، وہ دیوبند سے پڑھا ہے، اور دیوبندی سکول جیسا کہ ساری دنیا جانتی ہے۔شاہ ولی اللہ صاحب کے اساسی فکر پر مرتکز ہے، چنانچہ

1۔ دیوبند کی تعلیم

2۔ یورپ کی سیاست کا مطالعہ

3۔ اور شاہ ولی اللہؒ کا فکر

یہ تین چیزیں ہیں جنہوں نے ہمیں تاریخ کے واقعات اور حوادث کو اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھنے کا عادی بنادیا...... قرآن کا اس طرح مطالعہ کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ کتاب قرآنِ حکیم دنیا کی تمام اقوام کو ایک انٹرنیشنل انقلاب کی دعوت دیتی ہے، اور اس کا مقصود اصلی یہ ہے کہ تمام انسانیت کو ایک نقطۂ نظر پر جمع کرے''۔(46)

دیوبند کے قیام میں حضرت سندھیؒ نے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فکر اور دیوبند کے ماحول کا بلند اجتماعی مزاج اپنے دل و دماغ میں رچا بسالیا تھا۔ اب ضرورت تھی اس بات کی کہ قومی اور بین الاقوامی سیاست اور معیشت کا صحیح تناظر میں مطالعہ کیا جائے، اور سامراجی سیاست اور معیشت کے مقابلہ پر عملی نتائج کے حصول کے لیے محنت اور جدوجہد کی جائے۔

## اس تفسیری اسلوب کے چند مراکز

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنے استاذ حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسنؒ اور ان کے رُفقاء کے فکر و عمل کی اساس پر امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و معارف کو پھیلانے کے لیے انتہا درجہ جدوجہد اور کوشش کی، خاص طور پر ان کے تفسیری اسلوب کی اساس پر اپنے دور کے اجتماعی اور سیاسی مسائل کے حل کے لیے قرآن حکیم سے رہنمائی لینے کے لیے چند مراکز قائم کیے۔ جن میں (۱) ایک مرکز مدرسہ دارالرشاد پیر گوٹھ جھنڈا، حیدرآباد، سندھ ہے، جہاں مولانا سندھیؒ سات سال تک حضرت شیخ الہندؒ کے بتائے ہوئے طریقے کار کے مطابق الفوز الکبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کی اساس پر قرآنی علوم و معارف منتقل کرنے میں مصروف رہے، نیز حضرت شیخ الہندؒ کے نظریئے پر افراد سازی کا کام کرتے رہے۔ (۲) دوسرا مرکز نظارۃ المعارف القرآنیہ، دہلی ہے، جہاں مولانا سندھیؒ نے جمعیۃ الانصار کے تحت منظور شدہ طریقہ کار کے مطابق جدید و قدیم تعلیم یافتہ حضرات میں قرآنی علوم و معارف پھیلانے کا کام کیا۔ اس سلسلے کا (۳) تیسرا مرکز کابل ہے، جہاں مولانا سندھیؒ نے جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی تربیت کے لیے قرآن حکیم سے اجتماعی مسائل میں رہنمائی لینے کا طریقہ اور درس و تدریس کا سلسلہ قائم رکھا۔ مولانا سندھیؒ کے اس تفسیری اسلوب کا (۴) چوتھا مرکز مکۃ المکرّمہ مسجد الحرام ہے، جہاں مولانا سندھیؒ نے بارہ سال

www.rahimia.org

تک مسلسل قرآن حکیم کے علوم و معارف اور احادیث نبویہ کی تعلیم و تدریس حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ کے طے کردہ گزشتہ تفسیری اسلوب کو سامنے رکھتے ہوئے کی۔ اور پھر اس تفسیری اسلوب کا (۵) پانچواں دور وہ ہے، جب حضرت سندھیؒ 1939ء میں ہندوستان واپس تشریف لائے اور آپ نے مدرسہ دار الرشاد گوٹھ پیر جھنڈا، مدرسہ قاسم العلوم، شیرانوالہ گیٹ لاہور، بیت الحکمت جامعہ ملیہ، دہلی میں اپنے شاگردوں کو اس اسلوبِ تفسیر پر قرآن حکیم کی سورتوں کا انقلابی درس دیا۔ یہ اس تفسیری اسلوب کے ارتقاء کا تکمیلی دور ہے۔ ان پانچوں ادوار اور مراکز میں آپ کی تربیت سے اہم ترین علماء اور فضلاء تیار ہوئے اور جنہوں نے آپ کے تفسیری انداز واسلوب کو بڑی دیانتداری اور ذمہ داری کے ساتھ تحریری صورت میں قلمبند کیا۔ ان مراکز کی تفصیل درج ذیل ہے:

## (ا) ''مدرسہ دارالرشادٗ''، گوٹھ پیر جھنڈا، حیدرآباد، سندھ

مولانا سندھیؒ دیوبند سے تعلیم حاصل کر کے جب سندھ واپس تشریف لے گئے تو آپ کے ذہن میں دارالعلوم دیوبند کے طرز پر سندھ میں ایک مرکز قائم کرنے کی سوچ کارفرما رہی اور اس سلسلے میں آپ نے بہت زیادہ کوشش کی، چھ سات سال کی جدوجہد کے بعد آپ نے 1902ء میں حیدرآباد کے قریب قرآنی علوم و معارف پھیلانے کے لیے ''دارالرشادٗ'' کے نام سے گوٹھ پیر جھنڈا میں ایک مرکز قائم کیا، چنانچہ مولانا سندھیؒ خود لکھتے ہیں:

**وافادنی (شیخ الهند مولانا محمود حسنؒ) بحل ما استشکلته من کلام الولی اللهین عموماً و من کلام الصدر الشهید خصوصاً فی السیر والسیاسة، و ارشدنی تغمده الله بغفرانه طریق الدعوة الی السنة و توسمت فیه مخایل من الشیخ عبدالعزیز و من الشیخ محمد اسماعیل الشهید، فحمدت الله علی ان وفقنی للاستفادة عنه و وجدته (شیخ الهندؒ) رؤفاً بی رحیماً. بعد مارجعت الی السند اشتغلت بتوجیه الانظار الی تأسیس فرع دارالعلوم و کابدت فیه المشاق حتی یسر الله تعالیٰ ذالک فی سنة ۱۳۱۹ھ (1902ء) و اسست "دارالرشاد" فی "بیر جندا" قریباً من حیدر آباد السندیه. (47)**

''میں نے اپنی اُن مشکلات کا تذکرہ شیخ الہندؒ سے کیا جو ولی اللہی جماعت کے اکابرین کی تحریرات کے سمجھنے میں مجھے پیش آ رہی تھیں، تو حضرت شیخ الہندؒ نے مجھے ان کے سمجھنے میں رہنمائی فرمائی، خاص طور پر حضرت شیخ الہندؒ نے مجھے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی وہ تحریرات سمجھائیں، جن کا تعلق سیاست اور جہادِ حریت کے ساتھ تھا، اور اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے منور کرے کہ انہوں نے مجھے سنت کے مطابق دعوت کا صحیح طریقہ کار سمجھایا اور اس سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے خیالات سے آگاہی دی، پس اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے مجھے حضرت شیخ الہندؒ سے استفادہ کی توفیق عطاء فرمائی اور میں نے حضرت شیخ الہندؒ کو اپنے اوپر انتہائی شفقت کرنے والا اور انتہائی مہربان

پایا۔ پھر میں جب سندھ لوٹا، تو وہاں میری پوری توجہ دارالعلوم (دیوبند) کی ایک شاخ قائم کرنے کی طرف متوجہ رہی، اور اس سلسلے میں میں نے بڑی مشقت برداشت کی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ۱۳۱۹ھ (1902ء) میں میرے لیے آسانی پیدا کردی، اور میں نے ''پیر جھنڈا'' میں، جو حیدر آباد سندھ کے قریب ہے، ''دارالرشاد'' قائم کیا''۔

اس مرکز میں حضرت سندھیؒ نے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و معارف اور اسلوبِ تفسیر کو سامنے رکھتے ہوئے تقریباً سات سال سینکڑوں، ہزاروں طلباء کی تعلیم و تربیت کی اور انہیں حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت کے ساتھ وابستہ کیا۔ اس دور میں آپ سے تعلیم حاصل کرنے والے حضرت مولانا ابو محمد احمد بن حسین چکوالیؒ اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ وغیرہ ہیں۔

## (۲) ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کا قیام اور اس کا پس منظر

حضرت سندھیؒ کے تفسیری اسلوب کا دوسرا دور ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے قیام کا ہے، اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ 1911ء اور 1912ء میں ہندوستان کی ملکی سیاست اور بین الاقوامی حالات نے ایک بڑی کروٹ لی، وہ اس طرح کہ برطانوی سامراج نے جب سے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا، اس کا دارالخلافہ ''کلکتہ'' تھا۔ ظاہری طور پر ہندوستانی سیاست کا مرکز یہی شہر قرار پایا۔ لیکن 1911ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کا دارالخلافہ کلکتہ سے دہلی منتقل کرلیا۔ اور اس کا بڑا مقصد شمالی ہندوستان میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانا اور چین، افغانستان، ایران اور روس پر دباؤ پیدا کرکے اس خطہ پر اپنی بالادستی کو برقرار رکھنا تھا، چنانچہ 12 دسمبر 1911ء کو برطانوی بادشاہ جارج پنجم نے دہلی میں ایک بڑا دربار منعقد کیا، اور دہلی کو برطانیہ کی ہندوستانی حکومت کا دارالخلافہ بنا دیا۔ اور اسی موقع پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان بھی ہوا، جس سے ہندوستان کی قومی سیاست میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اور تمام تر سیاسی سرگرمیوں کا رخ ''کلکتہ'' کی بجائے ''دہلی'' کی طرف ہوگیا، اس طرح دہلی ہندوستانی سیاست کا مرکز و محور بن گیا۔

بین الاقوامی سیاست اور معیشت کے حوالے سے بھی یہ سال بڑی اہمیت کے حامل تھے، وہ اس طرح کہ یورپین ممالک کی سرمایہ پرستانہ ذہنیت نے عالمی بحران کی شکل اختیار کرلی، انہوں نے اپنی فاضل پیداوار کی کھپت کے لیے اپنے زیر تسلط علاقوں میں اضافہ کے لیے جنگوں کا سلسلہ شروع کردیا، اس طرح ان کی ہوس زر نے پوری دنیا کو بحران میں مبتلا کردیا۔ چنانچہ برطانیہ، فرانس اٹلی، اور روس نے سلطنت عثمانیہ کے مختلف صوبوں اور علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے ایسی ہولناک جنگوں کا آغاز کیا، جو آگے چل کر جنگ عظیم اول کی صورت اختیار کرگئیں۔ ایک طرف اٹلی نے برطانیہ اور فرانس کی شہہ پر 30 ستمبر 1911ء کو طرابلس پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔ (48) تو دوسری طرف زار روس، برطانیہ اور فرانس کی مشترکہ سازش سے بلقان کی ریاستوں، بلغاریہ مانٹی نیگرو، سربیا، البانیہ اور یونان نے ترکی کے علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے اعلانِ جنگ کردیا۔ چنانچہ سب سے پہلے مانٹی نیگرو نے 18 اکتوبر 1912ء

www.rahimia.org

کو ''بابِ عالی'' کے خلاف اعلان جنگ کیا، (49) اس کے بعد یکے بعد دیگرے دوسری بلقانی ریاستوں نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ میں اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لیے شمولیت اختیار کرلی، ایک طرف یورپ میں سرمایہ دار ملکوں کی باہمی کشمکش جاری تھی، دوسری طرف ایشیا میں زارِ روس کے مقابلہ پر برطانیہ چین و ایران اور افغانستان کی منڈیوں پر قبضہ کرنے کی حکمت عملی اپنائے ہوئے تھا، اس طرح سرمایہ دارانہ ذہنیت نے عالمی سطح پر انسانیت دشمنی پر مبنی ایسی تباہی و بربادی مچائی، جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، چنانچہ قرآن کو ماننے والی جماعت کے لیے انسانیت دوستی کی اساس پر یہ ضروری ہوگیا کہ اس کے خلاف اپنی عملی جدوجہد کو زیادہ زوردار طریقہ سے منظّم کرے۔

ان قومی اور بین الاقوامی حالات کے مقابلہ پر یہ ضروری تھا کہ ہندوستان کی قوم پرست اور انسانیت دوست قوتوں کو یکجا جمع کیا جائے، بالخصوص مسلمانوں کے جو دو دھڑے جدید اور قدیم تعلیم یافتہ حضرات کے بنتے جارہے تھے، ان کی دوری کو ختم کر کے سرمایہ دارانہ قوتوں کے خلاف قومی جدوجہد آزادی کو منظّم کیا جائے، چنانچہ علی گڑھ کی نوجوان طاقت میں قرآنی تعلیمات کی اساس پر قومی جدو جہد کا شعور بیدار کرنا از بس ضروری ہوا، انہی سالوں میں علی گڑھ کی اولڈ بوائز یونین کے روح رواں مولانا محمد علی جوہر نے کالج کی انتظامیہ کی سرکاری سرپرستی سے تنگ آکر صحافت کے ذریعے قومی جدو جہد کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا، پہلے کلکتہ سے انہوں نے ''کامریڈ'' کا آغاز کیا، اور جب دار الحکومت دہلی میں منتقل ہوگیا، تو مولانا محمد علی جوہر دہلی آگئے، اور ''کامریڈ'' بھی دہلی سے نکلنے لگا، (50) کامریڈ کے پہلے ہی شمارہ میں مولانا محمد علی جوہر نے جمعیۃ الانصار کے قومی تعلیمی پروگرام کی بھرپور تائید کی، اور ''دیوبند'' و ''علی گڑھ'' کے درمیان قومی نقطہ نگاہ سے تعلیمی پروگرام کی حمایت میں زوردار تحریر لکھی۔ (51) چونکہ علی گڑھ کی انتظامیہ اس میں مخلص نہ تھی، اس لیے ضروری ہوا کہ نوجوانوں کو قومی سیاسی پروگرام میں شریک کیا جائے اور اس کے لیے مولانا محمد علی جوہر کی وساطت سے ''دہلی'' سے کام کو آگے بڑھایا جائے۔

## ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کا دہلی میں قیام

دیوبند کے حضرات سرپرستان حضرت اقدس رائے پوریؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت سہارنپوریؒ نے قومی اور بین الاقوامی حالات کے تناظر اور جدید و قدیم تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان قومی جدوجہد کے حوالے سے دہلی میں ایک مرکز قائم کرنے کی منصوبہ بندی کی، اور باہم مشاورت سے طے ہوا کہ ''جمعیۃ الانصار'' کے مقاصد کو ''دہلی'' کے مرکز سے بانداز دیگر آگے بڑھایا جائے، اس کے لیے ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ ہو۔ جسے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کا نام دیا گیا۔

چونکہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ ''جمعیۃ الانصار'' میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اس طرح کا کام کر کے اپنے صلاحیت کا واضح اظہار کر چکے تھے، اور آپ میں یہ خصوصیت بھی تھی کہ ولی اللّٰہی علوم و افکار کے اصول پر جدید و قدیم تعلیم یافتہ حضرات کو اپنے دروس قرآنِ کریم سے اچھی طرح مطمئن کر سکتے تھے، نیز قومی سیاسی مقاصد کے حصول کے

لیے عملی سرگرمی میں بھی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور غیر موافق حالات میں بھی صبر و ہمت کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ آپ کو حاصل تھا۔ چنانچہ دہلی کے مرکز کے لیے آپ کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور ان حضرات اکابرین ثلاثہ نے حضرت سندھیؒ کو اپنا نمائندہ بنا کر دہلی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

چونکہ ان اکابرین ثلاثہ کی جماعت میں عملی نوعیت کے امور کی انجام دہی کی ذمہ داریاں حضرت شیخ الہندؒ کے سپرد تھیں، اس لیے حضرت شیخ الہندؒ اس مقصد کے لیے حضرت سندھیؒ کو دیوبند سے دہلی لائے، اور وہاں اپنے متعلقین بالخصوص حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے آپ کا تعارف کرایا۔ اور دہلی میں اس قسم کا ادارہ قائم کرنے کے لیے ہدایات دیں۔ چنانچہ ان حضرات کے ساتھ مل کر حضرت سندھیؒ نے جامع مسجد فتح پوری، دہلی میں ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' قائم کیا، اس کے قیام کے اساسی مقاصد، پس منظر اور بنیادی نظامِ کار کے بارے میں حضرت سندھیؒ ''التمہید'' میں تحریر فرماتے ہیں:

**لما امرت الحكومة البرطانية لشعبتها الهندية لانتقالها من "كلكته" الى "دهلى" و اجتمعت الجمعيات السياسية فى هذا المركز الجديد، اقمت فى دهلى بامر الشيخ من سنة ١٣٣١ هجرى و اسست "نظارة المعارف القرآنية" و مدرستها و كان يدرس فيها القرآن العظيم على طريق الاعتبار باصول "الفوز الكبير" و يدرس "حجة الله البالغة" مع الوقوف التام على الحالة السياسة الحاضرة، فاشترک فى تلک الجمعية اكابر زعماء المسلمين مثل النواب وقار الملک من على گڑه و الحكيم مسيح الملک محمد اجمل خان من دهلى مع شيخنا شيخ الهند من ديوبند واجتمع هناک الشبان من علماء الدين والشبان من قواد السياسة للمسلمين ولو قدر لنا الاستدامة على ذالک العمل لكان نفعه عظيما للمسلمين .(52)**

''جب برطانوی حکومت نے ہندوستان کا دار الحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کیا، اور اس نئے سیاسی مرکز میں ملک بھر کی سیاسی جماعتوں کا اجتماع ہونے لگا، تو ۱۳۳۱ھ (1913ء) میں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے میں نے اپنا قیام دہلی میں کرلیا، یہاں میں نے ایک ادارہ ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے عنوان سے قائم کیا، اس ادارہ میں ''الفوز الکبیر'' میں بیان کردہ اصولِ تفسیر کی روشنی میں فن ''اعتبار'' کے مسنون طریقہ کار کے مطابق درسِ قرآن دیا جاتا تھا۔ اور ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اس طرح پڑھائی جاتی تھی کہ سیاست حاضرہ کے حالات سے بھی مکمل واقفیت حاصل ہوتی رہے۔ اس ادارہ میں مسلمانوں کے بڑے بڑے رہنما مثلاً علی گڑھ سے نواب وقار الملک، دہلی سے مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں، حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ شریک کار تھے، اس ادارے میں مسلمانوں کے سیاسی رہنماؤں میں سے جدید تعلیم یافتہ نوجوان، اور

www.rahimia.org

علماء دین میں سے بھی نوجوان حضرات کا اچھا خاصہ اجتماع ہو گیا تھا۔ اگر ہمیں مستقل طور پر اس عمل کو جاری رکھنے کا موقع ملتا، تو مسلمانوں کے لیے اس سے اچھے نتائج سامنے آتے"۔

## "نظارۃ المعارف القرآنیہ" کے اساسی اصول

یہ ادارہ "نظارۃ المعارف القرآنیہ" دہلی کی مشہور فتح پوری مسجد کے شمالی کمروں میں قائم کیا گیا تھا، اور اس کا قیام 13 جون 1913ء/ 7 رجب ۱۳۳۱ھ کو عمل میں آیا۔ اس کا افتتاحی جلسہ اسی دن جامع مسجد فتح پوری میں ہوا، اور دوسرا جلسہ 4 جولائی 1913ء کو اسی جگہ منعقد ہوا۔ اس ادارہ کے طبع شدہ اصولِ اساسی کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

(الف) تعلیم یافتہ مسلمانوں کو قرآنِ مجید پڑھانا۔

(ب) اسلامی مکاتیب، مدارس، سکول اور کالجوں میں معلمینِ قرآن تیار کرنا۔

(ج) قرآنِ حکیم کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرانا۔

(د) قرآن شریف کے مضامین کو عام فہم بنانا، اور ان کی اشاعت و ترویج کے لیے تمام ممکنہ وسائل عمل میں لانا۔

(ہ) قرآنِ حکیم پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا تحریراً و تقریراً جواب دینا۔

(د) عربی دان گریجویٹس کو ایک سال میں پورا قرآنِ حکیم اور حجۃ اللہ البالغہ پڑھانا، اس کے ساتھ ساتھ ام الصحاح مؤطا مالک مع شرح شاہ ولی اللہ کو پڑھانا، نیز بخاری، مسلم اور ترمذی کے اس قدر حصص پڑھانا جس سے طلباء ان کتب سے واقف ہو جائیں"(53)

اس طرح قرانی علوم و معارف کے پھیلاؤ کے لیے جو حکمت عملی بنائی گئی، اس کے مطابق قرآنِ حکیم کو عام فہم انداز میں کچھ اس طرح پڑھایا جائے، کہ نوجوانوں میں دین اسلام کی اساسی اور بنیادی تعلیمات پر کامل اعتماد و یقین پیدا ہو، اور ان میں جذبہ حریت بیدار ہو، اور دینی تعلیم سے نوجوانوں کے ذہن اس طرح بیدار ہوں کہ وہ برطانوی سیاسی مقاصد کا آلہ کار بننے کی بجائے، قومی سیاسی شعور کے حوالے سے خود اعتمادی کے حامل بنتے چلے جائیں۔ اس طرح نوجوانوں میں قومی سیاست اور اس حوالے سے حریت کا جذبہ پیدا ہوتا چلا جائے۔

## "نظارۃ" میں تربیت کا نظام

نظارۃ المعارف القرآنیہ میں طلباء کی تربیت اور ان میں تحقیق و اجتہاد کی صلاحیت کو کس طرح نکھارا جاتا تھا، اس کی وضاحت حضرت سندھیؒ کے اس بیان سے سامنے آتی ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

"ہم نے مدرسہ نظارۃ المعارف میں جدید و قدیم تعلیم یافتہ حضرات میں سے پانچ پانچ افراد کا انتخاب کیا، اور انہیں ایک کلاس میں اس طرح رکھا کہ دو دو افراد کے درمیان بھائی چارہ قائم ہو جائے، جدید و قدیم تعلیم یافتہ احباب میں دو دو کی جماعت کو ایک فردِ واحد کی طرح بنا دیا گیا۔ ان کی تعلیمی

مشغولیت درجِ ذیل میدانوں میں مقرر کی گئی:

(الف) کلام اللہ ''قرآنِ حکیم'' میں اس طرح غور وفکر کیا جائے کہ حالاتِ حاضرہ میں اس کے نتائجِ عبرت بالکل واضح ہوں۔ گویا ''عبرت'' اور ''اعتبار'' کے اصول پر کلام اللہ میں غور وفکر۔

(ب) حجۃ اللہ البالغہ کو تحقیق سے پڑھنا۔

(ج) مسلمانوں کی قومی اجتماعی سیاست اور یورپ میں غالب سیاسی فکر وعمل کے درمیان موازنہ کرنا۔

اس طرح ان حضرات میں تحقیق واجتہاد کا اچھوتا اور منفرد اسلوب پیدا کرنے کے لیے کوشش کی گئی ...لیکن تھوڑے عرصہ بعد جنگ عظیم اول چھڑ گئی، اور مجھے شیخ الہندؒ کے حکم سے ۱۳۳۳ھ (1915ء) میں ہندوستان چھوڑنا پڑا، اس طرح ۱۳۳۵ھ (1916ء) میں یہ ادارہ حکومت نے سیل کر دیا''۔(54)

## ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' انگریز سامراج کی نظر میں

حضرت سندھیؒ نے اس ادارہ میں تقریباً دو سال کام کیا، اتنے مختصر سے عرصہ میں آپ کے درسِ قرآن کے طرز نے دہلی میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ قرآنی علوم ومعارف کے ان دروس نے جذبۂ حریت کچھ اس انداز میں پیدا کیا کہ برطانوی حکومت کے سیاسی مرکز میں اس کی لہریں محسوس ہونے لگیں، چنانچہ انگریز حکومت کی طرف سے اس کی جاسوسی ہونے لگی، جس کی کچھ تفصیلات ''ریشمی خطوط سازش کیس'' سے ہمارے سامنے آتی ہیں، برطانوی حکومت اس ادارہ کو کس نظر سے دیکھتی رہی، اس کو بیان کرتے ہوئے اس کیس کے پیراگراف نمبر 17 سے 20 تک میں کہا گیا ہے:

''پیراگراف نمبر 17: یہ مدرسہ (نظارۃ المعارف القرآنیہ) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، قرآن کی مبینہ اور اصلی تشریح کے لیے قائم کیا گیا تھا، عربی زبان کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، لیکن اس کا کوئی تعلق اس معاملہ سے نہیں۔

سازشیوں میں سے عبید اللہ ناظم اور احمد علی نائب ناظم تھے، خواجہ عبد الحیٔ اور انیس احمد کو وظیفہ ملتا تھا، مولانا محمود حسن، مولوی ابو الکلام آزاد اور مولوی فضل الحسن (حسرت موہانی) وزیٹر اور قصور کے محی الدین اس کے رفقاء میں شامل تھے۔

پیراگراف نمبر 18: عبید اللہ نے قرآن کی جو خاص تشریح وتفسیر بنائی، وہ جہاد کی فرضیت کے بارے میں تھی، اس موضوع پر عبید اللہ کی تعلیمات کو انیس احمد نے ''تعلیم قرآن'' اور ''کلید قرآن'' نام کی دو کتابوں میں 1914ء، 1915ء میں تعیین اور صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

پیراگراف نمبر 19: ان دونوں کتابوں میں مختصراً ہندوستانی مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ ان کی موجودہ حالتِ محکومی کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے ایک بڑے مذہبی فریضہ جہاد کو نظر انداز کر دیا ہے، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شروع کے متبعین نے اس فریضہ پر عمل کر کے دنیاوی اقتدار اور

www.rahimia.org

مذہبی سربلندی حاصل کی تھی.....

پیرا گراف نمبر 20: اس درس کے علاوہ جو''نظارۃ'' میں دیا جاتا تھا، اور جو صریحاً درست نہیں تھا،

یہ ادارہ سازشیوں کے وقتاً فوقتاً مل بیٹھنے کے لیے بھی ایک تخلیہ گاہ کا کام دیتا تھا''۔(55)

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا سندھیؒ کی راہنمائی میں''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' محض درس و تدریس کا ایک مدرسہ ہی نہ تھا، بلکہ قرآنی علوم و معارف کا ایک ایسا جاندار طرز وفکر عمل تھا، جس کے اثرات مسلمانانِ برصغیر کی قومی زندگی پر نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں، اس ادارہ میں جہاں قرآنی علوم و معارف کے بلند پایہ افکارِ عالیہ کو سمجھنے سمجھانے اور شعور بیدار کرنے کا کام ہوتا تھا، وہاں انگریز سامراج کے خلاف جذبۂ حریت بھی بھر پور طریقہ سے پیدا کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ تک محققین علماء ربانیین کے اساسی فکر وعمل کو بنیاد بنا کر قومی سیاسی جدوجہد کے لیے افراد سازی کے لیے ماحول بنایا گیا تھا، اس طرح قرآنِ حکیم کی تفسیر وتشریح کا ایک ایسا وقیع اسلوب اور طرزِ تعبیر سامنے آیا، جو فکر وحکمت کی آفاقیت، وسعت اور گہرائی کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ قومی جذبہ جہاد کے لیے جوشِ عمل کو منظّم کرنے کی خصوصیت لیے ہوئے تھا۔

## نظارۃ کے تعلیمی وتربیتی اثرات

''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' محض چند طلبا کی تعلیم وتعلم تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ یہ ادارہ ایک ایسے ماحول کا نام تھا، جس کے اثرات ہندوستان کے طول وعرض میں بڑی تیزی کے ساتھ منتقل ہوئے، اس ادارہ نے کلکتہ سے کراچی تک قوم پرست مسلمان قوتوں کو منظّم کیا، قرآنِ حکیم کی عالمی حکمت کے عملی انطباق کے حوالے سے واضح جذبہ عمل پیدا کیا، قومی سیاست میں اپنے افکار ونظریات اور تعلیمات کا دوٹوک اظہار دیا، بین الاقوامی سیاست کے حوالے سے جدوجہد کا قطعی راستہ متعین کیا، اور ان تمام پہلوؤں کے حوالے سے کراچی سے کلکتہ تک جتنی چھوٹی چھوٹی قوتیں اپنی اپنی جگہ کام کر رہی تھیں، انہیں ہندوستان کی سطح پر ایک قومی نظم میں پرو دیا۔ ان میں باہمی ارتباط فکر وعمل پیدا کیا۔

رشد و ہدایت کا وہ سلسلہ جو دیوبند، گنگوہ، رائے پور اور سہارنپور کے افق سے ہندوستان میں طلوع ہوتا، وہ پورے ملک میں پھیلتا چلا گیا۔ چنانچہ حیدر آباد سندھ کے قریب پیر جھنڈا کا''دار الرشاد'' ہو یا جمعیۃ الانصار کا شعبہ ''جمعیۃ الارشاد'' ہو، وہ نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کا سلسلہ رشد و ہدایت ہو، یا کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا قائم کردہ ''دار الارشاد'' ہو، یا پھر جامعہ ملیہ میں قائم کردہ''سلسلہ الارشاد'' اور''دار الرشاد'' ہو، یہ سب کے سب دیوبند اور گنگوہ کے اسی سلسلہ عالی کے فیضانِ فکر وعمل کے اثرات اور نتائج ہیں، چنانچہ کلکتہ کے دار الارشاد کے بارے میں''ریشمی خطوط سازش کیس'' میں واضح طور پر پیرا گراف نمبرز 28,27 میں تحریر ہے:

''مولوی ابوالکلام آزاد نے اگست 1915ء میں مولوی عبید اللہ سے مشورہ کے بعد نظارۃ المعارف

القرآنیہ کے خطوط پر کلکتہ میں مدرسہ قائم کیا، جس کا نام ''دار الارشاد'' رکھا، اس مدرسہ میں ابو الکلام آزاد تعلیمات قرآنی کا درسِ قرآن دیا کرتا تھا۔ عبید اللہ کی طرح ابو الکلام کے درس میں بھی سچے مسلمانوں پر جہاد کی فرضیت کے بارے میں زور دیا گیا ہے، ابو الکلام آزاد کی تقریروں کی یادداشتوں کے مجموعے طلبہ نے تیار کیے تھے''۔(56)

''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے قرآنی اسلوب تفسیر نے مسلمانوں کے اہم ترین اداروں اور ان کے روح رواں افراد کی زندگیوں میں ایسی تبدیلی پیدا کی، جس نے آئندہ چل کر قومی تحریکات کی صورت گری میں بنیادی کردار ادا کیا ،علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ مخلص افراد کو اس اسلوبِ تفسیر نے جس خوبی سے متاثر کیا، اس کا اثر ونتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگیوں میں انقلاب آ گیا، چنانچہ علی گڑھ کالج کی اولڈ بوائز یونین کے روح رواں محمد علی جوہر کی زندگی میں واضح تبدیلی کا اثر اسی اسلوبِ تفسیر قرآن کی وجہ سے پیدا ہوا، چنانچہ مولانا محمد علی جوہر حضرت سندھیؒ کی رفاقت اور نظارہ کے ماحول کی وجہ سے ''تحریک ریشمی رومال'' کے سرگرم افراد میں شمار ہوتے ہیں، اور میدانِ صحافت میں ترکوں کی امداد واعانت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں میں سے ہیں۔ مولانا جوہر ایک طرف تو ''نظارۃ'' کے قائم کردہ ماحول سے متاثر ہوئے تو دوسری طرف جب جہاد وحریت کے لیے کام کرنے کی بناء پر نظر بند ہوئے، تو قرآن کے مطالعہ نے آپ کی زندگی میں تبدیلی پیدا کر دی۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

''میری پہلی زندگی اور بعد کی زندگی میں علاوہ بیشتر پابندی احکامِ شریعت کے بس اس قدر فرق ہے کہ پہلے میں اسلام سے کم واقف تھا، اور ایک معنی میں اس پر بڑی حد تک ایمان بالغیب تھا، اور جب سے نظر بندی کے زمانہ میں مَیں نے قرآن کریم پہلی بار شروع سے آخر تک با معنی اور سمجھ کر پڑھا، میں سمجھتا ہوں کہ میں اسلام کے جوہر اور اس کی روح کو سمجھ گیا ہوں، اور پھر یورپ وایشیاء کے بعض ممالک کے مشاہدے نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ مذہب اسلام تفسیر حیات ہے، اور زندگی کے لیے آخری اور بہترین نظام ہے''۔(57)

مولانا محمد علی جوہر کے متعلق ''ریشمی خطوط سازش کیس'' میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ اس طرح ہے:

''جنودِ ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ جنرل ہے، محمد علی ایم۔اے ......دہلی کے اخبار ''کامریڈ'' کا بدنام ایڈیٹر ہے........ڈاکٹر انصاری کا گہرا دوست اور عبید اللہ کا قریبی ساتھی ہے''۔(58)

## اس دور کے نمایاں شاگرد اور ان کی تفاسیر

''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے اس مرکز تک جن افراد نے امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے اس تفسیری اسلوب کو سمجھا اور اسے صحیح طور پر قلم بند کیا اور قرآن حکیم کی تفاسیر لکھیں، ان میں نمایاں نام حضرت مولانا خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ کا ہے، جو جامعہ ملیہ، دہلی میں شعبہ اسلامیات کے سربراہ رہے اور جنہوں نے ''تفسیر الفرقان فی معارف

القرآن'' کے نام سے تفسیر قرآن حکیم لکھی۔ جس میں مولانا سندھیؒ کے اسلوبِ تفسیر کی اساس پر تفسیر قرآن حکیم بہت خوب صورت انداز میں تحریر کی گئی ہے۔ اسی دور کے حضرت سندھیؒ کے شاگرد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ بھی ہیں، جنہوں نے قرآن عزیز کا ترجمہ اور مختصر تفسیری نکات حواشی کی صورت میں تحریر کیے۔ جس میں قرآنی سورتوں کا خلاصہ اور رکوعات کے اجمالی مضامین کی تقسیم حضرت سندھیؒ کے اسلوب پر مکمل کی۔ اس ترجمہ وتفسیر پر کچھ لوگوں نے غلط فہمی کی بنیاد پر کچھ تنقید کی تو ہندوستان کے تمام سرکردہ علماء نے تقریظات لکھ کر اس کی مکمل تائید اور حمایت کی۔ جن میں علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا سید محمد سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا سلطان محمود، صدر مدرسہ عالیہ جامع مسجد فتح پوری، رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ وغیرہم جیسے اکابرین نے اس پر اپنے اعتماد کا اظہار فرمایا۔ اس تفسیری اسلوب پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے مولانا سید محمد سلیمان ندویؒ نے یہ تحریر کیا:

''عین اس وقت جب ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا، حکمت الٰہی نے اس غرض سے کہ اس آفتاب کے غروب سے مسلمانوں کے قلوب میں تاریکی نہ پھیلنے پائے، ایک اور آفتاب نکالا، جس نے اس وقت سے لے کر آج تک اس ملک کو اپنی نورانی شعاعوں سے منور رکھا ہے، یعنی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ اور ان کے اخلاف۔ شاہ صاحبؒ نے عوام کے لیے قرآن پاک کا فارسی ترجمہ کیا اور خواص کے لیے قرآن پاک کے علوم پر متعدد رسائل لکھے، شاہ صاحبؒ کے بعد ان کے صاحبزادوں میں سے مولانا شاہ رفیع الدین نے قرآن پاک کا اُردو میں ترجمہ کیا، اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے اردو میں قرآن پاک کی تفسیر ''موضح القرآن'' لکھی اور اردو میں قرآن پاک کا وہ ترجمہ کیا جو اپنی گونا گوں صفات کی بنا پر آج تک بے مثال ہے....

قرآن پاک کے علوم میں سب سے زیادہ دقیق اور نازک علم آیات اور سور کے باہمی ربط وتعلق کا ہے، امام رازیؒ اور بقاعیؒ نے اس پر بہت کچھ محنت کی ہے، اور دوسرے علماء نے بھی اس پر کافی غور و خوض کیا۔ ہمارے زمانے میں مولانا حمیدالدین صاحب فراہی صاحبِ ''نظام القرآن'' اور مولانا عبیداللہ سندھی خاص ذکر کے قابل ہیں، دونوں مدت تک اتحاد مذاق کے باعث کراچی میں باہم ملتے جلتے رہتے تھے، مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے درس نے متعدد باکمال پیدا کیے، جن میں سب سے پہلی جگہ مولانا احمد علی صاحب امیر ''انجمن خدام الدین'' (لاہور) کو حاصل ہے، موصوف نے اس درس میں جو کچھ پایا، اس کو وقفِ عام فرمایا''۔(59)

www.rahnuma.org

## (۳) کابل میں مولانا سندھیؒ کے دروسِ قرآنیہ

1915ء میں مولانا سندھیؒ جب کابل تشریف لے گئے تو وہاں ہندوستان سے ہجرت کر کے جانے والے وہ نوجوان جو تحریک ہجرت کے سلسلے میں لاہور کے کالجوں سے کابل چلے گئے تھے، ان کے سامنے دین اسلام کی سچی تعلیمات منتقل کرنے کے لیے مولانا سندھیؒ نے دروسِ قرآنیہ کا سلسلہ شروع کیا اور انہیں عام فہم انداز میں ''الفوز الکبیر'' کے بنیادی اصول، ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے بنیادی مباحث پڑھائے اور اس کی اساس پر قرآن حکیم کی آیات اور سورتوں سے اجتماعی مسائل حل کرنے کے سلسلے میں رہنمائی دی۔ اس سلسلے میں آپ کے خاص شاگرد جناب ظفر حسن ایبک نے ''الدین والسیاسۃ فی القرآن'' کے عنوان سے آپ کے ان دروسِ قرآنیہ کو قلم بند کیا ہے، یہ کتاب قلمی مسودے کی صورت میں تین جلدوں پر مشتمل ہے، اور اس میں قرآن پاک کی بہت سی سورتوں کی تفسیر، ''الفوز الکبیر'' کی تشریح اور ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے اہم مباحث کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

## (۴) مسجد الحرام میں حضرت سندھیؒ کے تفسیری دروس

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ 1927ء میں حرمِ محترم مکۃ المکرّمہ تشریف لے گئے تو آپ نے مسجد حرام میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اُسلوبِ تفسیر کے مطابق قرآن حکیم کی تفسیر، احادیث نبویہ کی تدریس شروع فرمائی اور مسلسل بارہ سال تک سینکڑوں، ہزاروں افراد نے آپ سے اس سلسلے میں فیض حاصل کیا۔ جس میں نہ صرف ہندوستان کے علماء اور فضلاء شامل تھے، بلکہ دنیا بھر سے آنے والے اہل علم اور اہل تقویٰ نے مولانا سندھیؒ سے ان کا تفسیری اسلوب سمجھا اور امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و عمل سے واقفیت حاصل کی۔ اس دور کے تفسیری دروس کو قلم بند کرنے والے لوگوں میں مولانا عبداللہ لغاریؒ ہیں، جنہوں نے ''المقام المحمود'' کے عنوان سے اردو میں تفسیر قلم بند کی، اور روسی عالم علامہ موسیٰ جار اللہؒ ہیں، جنہوں نے عربی زبان میں آپ کے تفسیری افادات کو قلم بند کیا، نیز مولانا محمد مدنیؒ ہیں، جنہوں نے سندھی زبان میں مولانا سندھیؒ کے تفسیری افادات قلم بند کیے۔

## (۵) مولانا سندھیؒ کی ہندوستان واپسی پر تفسیری دروس کا سلسلہ

1939ء میں مولانا سندھیؒ ہندوستان واپس تشریف لائے تو اس عرصے میں آپؒ نے مدرسہ دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا، مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور، بیت الحکمت جامعہ ملیہ، دہلی میں دروسِ قرآن کا سلسلہ قائم فرمایا۔ اور اس دور میں بھی آپ کی صحبت سے فیض یاب ہونے والے بڑے بڑے علماء اور نوجوان گریجویٹس رہے۔ اس دور میں آخری وقت تک آپ کے تفسیری افادات کو پوری ذمہ داری کے ساتھ قلم بند کرنے والے حضرت مولانا بشیر احمد لدھیانویؒ تھے۔ جن کے قلم بند کیے ہوئے تفسیری افادات پر حضرت سندھیؒ نے اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ آپ کے یہ

www.rahimia.org

تفسیری افادات ''قرآنی شعورِ انقلاب'' کے عنوان سے مرتب ہوکر شائع ہو چکے ہیں۔

## مولانا سندھیؒ کے تفسیری اسلوب پر علماء کا اعتماد

مولانا سندھیؒ کے اس تفسیری اسلوب پر سرکردہ علماء اور فضلاء نے اپنے اعتماد کا اظہار کیا، کیوں کہ یہ اس فکر و عمل کے مطابق ہے، جو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تک صحیح اور مستند علماء اور رہنمایانِ قوم نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا، اس ولی اللہی جماعت اور اس کے اسلوب کی مستند علمائے کرام نے مکمل تائید فرمائی ہے۔ چناں چہ علامہ مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:

**اشهد علی رؤس الاشهاد للعالم الاسلامی کآفةً، ان لو لم یقم اصابة دیوبند فی فیحاء الهند باعباء هذا الامر "العلم والدین والسیاسة" لم یکن الیوم علی سطحها العلم الصحیح والدین القیم سنةً و قرآناً و السیاسة الملیة.(60)**

''میں پورے عالم اسلامی کے لیے علی الاعلان گواہی دیتا ہوں کہ اگر دیوبند کی یہ جماعت ہندوستان کی فضاؤں میں علم، دین اور سیاست جیسے عظیم الشان کام کی طرف متوجہ نہ ہوتی تو آج پوری سطحِ زمین پر علمِ صحیح، قرآن وسنت پر مبنی دینِ قیم اور سیاست ملیہ باقی نہ ہوتی''۔

اس سے قبل مولانا بنوریؒ نے اس جماعت کے افراد کی ایک پوری فہرست امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر مولانا عبیداللہ سندھیؒ تک تحریر کی ہے، اس فہرست کے اہم افراد کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:

**منهم الزکی الفاضل مولانا الشیخ عبید الله السندی، صاحب الهمة العالیة و العزیمة الراسخة، خدم القوم والملة برهة من عمره والآن یقضی حیاته بمکة زادها الله تکریماً ومنعه الحکومة الحاضرة من العود الی الهند. (61)**

''علماء کی اس سچی جماعت میں سے انتہائی ذہین اور فاضل شخصیت مولانا شیخ عبیداللہ سندھی ہیں، جو انتہائی بلند ہمت اور بلند عزائم رکھنے والے لوگوں میں سے ہیں، انہوں نے اپنی تمام عمر قوم اور ملت کی خدمت کی ہے، اور اب اپنی زندگی مکۃ المکرّمہ میں گزار رہے ہیں، موجودہ حکومت نے انھیں ہندوستان آنے سے روک رکھا ہے''۔

## ہندوستان پر اس تفسیری اسلوب کے اثرات

اس طرح قرآنی تعلیمات اور اس کے علوم وافکار کے پھیلاؤ کے لیے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' ایسے مراکز نے جو ماحول ہندوستان بھر میں پیدا کیا، اس نے ملک کے طول وعرض میں قرآنِ حکیم پر غور وفکر کے نئے دریچے

کھول دیئے، انفرادی اور اجتماعی مسائل بالخصوص سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کے حل کے لیے قرآنِ حکیم کی طرف رجوع کرنے کا ذوق پیدا ہوا، اور یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے، کہ جب برطانوی سامراج اس خطہ میں ایک طرف مذہب سے وابستہ طبقات کو سیاست اور جہاد سے الگ کر کے اپنے مقاصد پورے کر رہا تھااور دوسری طرف عقل پرستی کے نام پر مذہب کی آفاقی اور انسانیت دوست تعلیمات سے دور کر کے انہیں فرقہ ورانہ راستہ پر ڈال کر اپنے سیاسی مقاصد کے لیے بطورِ آلہ کا راستعمال کر رہا تھا۔تو ایسے ماحول میں پورے عقل وشعور اور بصیرت کے ساتھ قرآنی تعلیمات کی انسان دوست حکمت سے جدید وقدیم تعلیم یافتہ حضرات کے ذہنوں کو منور کرنا اور مذہب و سیاست اور عقل وشعور کا امتزاج پیدا کرنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔اور آزادی اور حریت کے لیے جذبۂ جہاد کے ذریعہ برطانوی تسلط سے نجات حاصل کرنے کی قومی جدجہد کی راہ ہموار کرنا اس پر مستزاد ہے۔

نظارۃ المعارف القرآنیہ کے قائم کردہ ماحول نے ہندوستان کے ہر مخلص اور تعلیم یافتہ فرد کو بنیادی طور پر متأثر کیا۔جس کا اظہار آئندہ چل کر تحریک ریشمی رومال، تحریک خلافت، تحریک ترکِ موالات اور جامعہ ملیہ، جمعیۃ العلماء ہند اور مجلس احرار اسلام کی صورت میں ہوا، اور جو بڑی وضاحت کے ساتھ ہندوستان کی قومی تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔ان تمام تحریکات اور جماعتوں کے پس منظر میں وہی جذبہ کارفرما ہے، جو ''نظارۃ'' نے پیدا کیا، اور نظارۃ کا اصل کام بھی یہی تھا کہ ایسا ماحول پیدا کیا جائے، جس کے مندرجہ بالا نتائج ظاہر ہوں ۔ چنانچہ اس ماحول نے افرادسازی اور قومی جماعت سازی میں بنیادی کردار ادا کیا۔

اس تناظر میں ان مراکز کے پیدا کردہ ماحول نے ایسے افراد تیار کیے، جنہیں دنیا کا کوئی مفاد، خودغرضی اور لالچ یا دباؤ اپنے مقاصد سے منحرف نہیں کرسکتا تھا۔ایسے افراد تیار کیے جو قرآنِ حکیم کی عظمت ومحبت کو دل میں بٹھا کر اس کے بتلائے ہوئے، قومی جدوجہد آزادی کے راستہ پر بے دھڑک آگے بڑھتے چلے گئے، انہوں نے ہر طرح کی قربانیاں دے کر قرآنی نظریہ کے پھیلاؤ اور وطن کی آزادی کے لیے کام کیا، بڑے بڑے مصائب اور مشکلات کے پہاڑ ان پر ٹوٹے ، لیکن وہ نہ جھکے نہ بکے، بلکہ بڑی ہمت، جرأت اور صبر و استقامت کے ساتھ اپنے قرآنی مشن پر پورے تسلسل کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ چنانچہ ایسے افراد کی فہرست بہت طویل ہے، جنہوں نے قربانیاں دیں، ان میں بعض نے شہرت پائی، اور بہت سے ایسے گمنام ہیں، جن کی قربانیاں صفحہ قرطاس پر نہیں آئیں۔

## ولی اللہی اُسلوبِ تفسیر کی اہم شخصیات

وہ اہم ترین اور جامع افراد جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ، حضرت عالی رائے پوریؒ اور حضرت سہارنپوریؒ ایسے بزرگوں کی صحبت اٹھائی، اوران کے فیضان سے تربیت پا کر ''جمعیۃ الانصار'' اور ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کا ماحول بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا اور اسی حوالے سے کمال کو پہنچے، وہ قطب الارشاد حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر

www.rahimia.org

رائے پوریؒ، مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ دہلویؒ ، امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ ، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاداور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی جیسی عظیم شخصیات ہیں،فکر وعمل کے یہ وہ جامع حضرات ہیں ، جو قرآنی علوم و معارف کی ولی اللہی تفسیر وتعبیر کے علمی اور عملی ترجمان ہیں۔ ان حضرات نے عظیم قربانی اور محنت سے نہ صرف ابتدائی دور میں قرآنی علوم و معارف کے حوالے سے بہترین ماحول بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا ، بلکہ آئندہ کے ادوار میں حضرات ثلاثہ (حضرت عالی رائے پوریؒ ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت سہارنپوریؒ) کے جانشین کے طور پر ان کے فکر وعمل کو پوری جامعیت کے ساتھ قائم رکھا۔ یہی نہیں بلکہ قرآنی علوم ومعارف کی اساس پر قومی جدوجہد آزادی کے لیے افراد سازی اور جماعت سازی کے عمل کونہایت عمدگی سے جاری رکھا۔ ان حضرات میں گو شخصیات کے تنوع اور حالات سے عملی ذمہ داریوں کی نوعیت مختلف رہی ہے۔ لیکن ان حضرات کا بنیادی فکر وعمل ، حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جامع اسلوبِ تفسیر وتعبیر کے نشانِ امتیاز کو اپنے پیش نظر رکھنا تھا۔

اسی تفسیری اسلوب پر امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ''ترجمان القرآن'' لکھی، اس تفسیر میں دورِ حاضر میں انسانیت کو درپیش مسائل کے حل کے لیے واضح راستہ کا تعین کیا گیا۔ دورِ زوال سے نکلنے، جرأت و ہمت پیدا کرنے، غلامی سے آزادی کی طرف سفر کرنے، صبر و استقامت پیدا کرنے، سچائی پر قائم رہنے اور عدل و انصاف وحق و صداقت کا بول بالا کرنے کا عزم بیدار کیا گیا۔ نیز قومی آزادی کی سوچ پیدا کرنے اور انسانیت کے درمیان ہمدردی، بھائی چارہ، اور انسانی مسائل کو حل کرنے کا طریقہ واضح کیا گیا۔

یہی وہ تفسیری اسلوب ہے، جس کی جھلک مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی کتاب ''قصص القرآن'' اور ''اسلام کا اقتصادی نظام'' میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ چنانچہ قصص قرآنیہ کے حوالہ سے اولوالعزم انبیاء کی جدوجہد کو بیان کیا گیا ہے، اور غلامی سے آزادی کے حصول تک کے تلخ حقائق کا مقابلہ کرنے کا جذبہ بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ''قرآنی اصولِ معاشیات'' کے ضمن میں اسلام کے اقتصادی نظام کی وضاحت اس تفسیری اسلوب کے پس منظر میں بخوبی ہمارے سامنے آتی ہے۔

اسی طرح ولی اللہی اسلوبِ تفسیر کا ایک نمونہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی ''مجالسِ سبعہ'' پر مبنی وہ دروسِ قرآن ہیں، جو آپ نے تقریباً دوسو علماء کے سامنے پس دیوارِ زنداں ''نینی تال جیل'' میں دیئے تھے۔ اور جنہیں مولانا سید محمد میاں صاحبؒ نے قلم بند کیا، جس میں الفوز الکبیر میں بیان کردہ اصول کی روشنی میں تحقیقی اندازِ فکر پیش کیا گیا ہے۔

یہ تفسیری اسلوب اپنی کامل اور مکمل شکل میں امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور آپ کے عزیز ترین شاگردوں کے ہاں ملتا ہے، اس لیے کہ حضرت سندھیؒ، امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سلسلۂ فکر وعمل پر پورا عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ایسے اکابر سے براہِ راست تربیت حاصل کئے ہوئے تھے اور اس پر

مستزاد یہ کہ شروع دن سے آپ حضرت شیخ الہند کی نگرانی میں قومی اور بین الاقوامی حالات و واقعات اور عرفِ زمانہ کو پہچاننے اور اس کی اساس پر سیاسی کام کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔ آپ کو جنوبی ایشیا، یورپ اور بین الاقوامی سطح کی سیاست ومعیشت پر براہِ راست مطالعہ کر کے انسانی مسائل کو حقیقی تناظر میں سمجھنے، سیاسی تقاضوں اور معاشی حقوق کا صحیح ادراک حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے، اور پھر مسلسل بارہ سال مکہ معظّمہ میں بیٹھ کر حرم شریف کے پُرسکون ماحول میں ان امور پر قرآنی نقطہ نگاہ سے غور وفکر کرنے اور سوچ و بچار کرنے کا موقع ملا، اس تجلی ریز مقام کے اثرات آپ کے تفسیری اسلوب پر بڑے گہرے ہیں۔ اس طرح مولانا سندھیؒ کا تفسیری اسلوب اپنی جامعیت، معنویت اور وسعت کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی گہرائی لیے ہوئے ہے اور دورِ حاضر کے سیاسی، معاشی، قومی اور بین الاقوامی تمام مسائل کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ نظارۃ المعارف القرآنیہ کے تجربہ کے بعد مولانا سندھیؒ کا یہ تعلیم و تدریس کا سفر مسلسل جاری رہتا ہے، آپ نے کابل میں نوجوانوں کی ایک جماعت کو اسی اسلوب پر قرآن حکیم کی تفسیر پڑھائی، ماسکو میں مسلمان علماء نے آپ سے استفادہ کیا، ترکی میں نوجوانوں نے آپ کے سامنے زانوے تلمذ طے کیا اور مکہ معظّمہ میں دنیا بھر کے علماء اور طلباء نے آپ سے تفسیر اور حدیث کا درس لیا۔ اور واپس ہندوستان آنے پر دار الرشاد، پیر جھنڈا، قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ، لاہور، بیت الحکمت جامعہ ملیہ دہلی، دار العلوم دیوبند میں سینکڑوں علماء اور طلباء نے آپ سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اسلوبِ تفسیر پر قرآنی تعلیمات حاصل کیں۔ اور یوں آپ نے اس تفسیری اسلوب کی اساس پر تعلیم وتربیت اور شاگردوں کی تیاری کا سلسلہ جاری رکھا۔

اس صدی کی چھٹی دھائی تک ان جامع ترین شخصیات نے اپنے انفاسِ قدسیہ، بلند فکر اور بہترین اور منظّم جوش عمل کے ذریعہ قرآنی علوم و معارف کے اس جامع اسلوب کے ذریعہ ملک وملت کی خدمات سرانجام دیں۔ ان حضرات نے نہ صرف یہ کہ اپنے دور کے معروضی تقاضوں کے پیش نظر اس دور کے چیلنجز کا مقابلہ کیا اور بہترین لائحہ فکر وعمل بنا کر عظیم جدو جہد فرمائی، بلکہ اس جامع فکر وعمل کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے بھی انتھک محنت کی، دین اسلام کا وہ بلند نظریہ جو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ انسانیت دوستی کا درس عام کرتا ہے، اسے نوجوان نسل کے قلوب واذہان میں پیدا کرنے کے لیے شعوری جد جہد کی، اور اپنے قلب کے جذبۂ صادقہ سے کام لے کر اس عظیم شعوری جدوجہد اور اس عظیم نظریہ فکر وعمل کو آئندہ نسلوں کے سپرد کیا۔ فجزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائے۔

---

www.rahimia.org

# حوالہ جات


1۔ دہلویؒ، شاہ ولی اللہ، مقدمہ فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن، مطبوعہ تاج کمپنی، لاہور۔

2۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ، ص22، طبع بیروت۔

3۔ ایضاً، ص103، طبع بیروت۔

4۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، البدور البازغۃ، ص253، طبع شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ۔

5۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، باب الرسوم السائرہ فی الناس، ص104، عربی، طبع بیروت۔

6۔ ایضاً، ص120، طبع بیروت۔

7۔ ایضاً۔

8۔ ایضاً ص173۔

9۔ القرآن، ۱۰:۶۶۔

10۔ القرآن، ۲:۱۷۴۔

11۔ القرآن، ۵۷:۲۷۔

12۔ القرآن، ۲:۸۔

13۔ القرآن، ۱۶:۱۲۵۔

14۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ الفوز الکبیر فارسی، ص13، طبع فرید بک ڈپو، مٹیا محل، دہلی نمبر6۔

15۔ ایضاً (اردو)۔

16۔ الفوز الکبیر فارسی، ص140۔

17۔ الفوز الکبیر اُردو ترجمہ، ص140۔

18۔ الفوز الکبیر فارسی، ص159۔

19۔ الفوز الکبیر اُردو ترجمہ، ص159۔

20۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، مقدمہ فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن، مطبوعہ تاج کمپنی، لاہور۔

21۔ شہید، سید احمد، مکاتیب سید احمد شہیدؒ، مکتوب بنام شاہِ بخارا، ورق 28 (الف)، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، لاہور۔

22۔ خطبۂ صدارت اجلاس جمعیت علماء، صوبہ سندھ، منعقدہ، 17,16,15 اپریل 1944ء، مطبوعہ حیدرآباد، سندھ۔

23۔ شیخ الہند، مولانا، محمود حسن، مقدمہ ترجمہ شیخ الہندؒ۔

24۔ میرٹھی، مولانا عاشق الٰہی، تذکرۃ الخلیل، ص249، طبع سہارنپور۔

25۔ سندھی، مولانا، عبیداللہ، قرآنی فکر انقلاب، ص7، مطبوعہ بیت الحکمت، لاہور۔

26۔ آزاد، عبدالخالق، سوانح شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، ص153، مطبوعہ مکی دارالکتب، لاہور۔

27۔ شیخ الہندؒ، مولانا محمود حسن، مسدسِ مالٹا۔

28۔ سندھی، عبیداللہ، مولانا، التمهيد لتعريف آئمة التجديد، ص24، عربی، مطوعہ حیدرآباد، سندھ۔

29۔ سندھی، عبیداللہ، مولانا، مقدمہ قواعد و مقاصد جمعیۃ الانصار، ص:2، مطبوعہ دیوبند۔

30۔ ایضاً، ص:3۔

31۔ ایضاً۔

32۔ ایضاً۔

33۔ سندھی، مختصر روئداد اجلاس جمعیۃ الانصار، ص:21 تا 26، طبع دیوبند۔


www.rahimia.org

34۔ سندھی، روئداد جلسہ مؤتمر الانصار مراد آباد، ص:136، طبع دیوبند۔
35۔ سندھی، قواعد و مقاصد جمعیۃ الانصار، ص:28، طبع دیوبند۔
36۔ ایضاً، ص:8۔ 37۔ مدنی، مولانا، سید حسین احمد، سفرنامہ اسیر مالٹا، ص9، طبع مکتبہ زکریا، لاہور۔
38۔ سندھی، مضمون ''چندہ ہلالِ احمر اور دار العلوم دیوبند''، ماہنامہ ''القاسم'' ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ، ص:20,19، طبع دیوبند۔
39۔ دیوبندی، اصغر حسین، سید، ''حیاتِ شیخ الہند'' طبع دیوبند۔
40۔ الحسینی، نفیس، سید، مضمون، تحریک ریشمی رومال کے سرپرست اعلیٰ، مطبوعہ ''ماہنامہ تذکرہ'' لاہور۔
41۔ سندھی، امالی عبیدیہ قلمی، ص:194، مکتوبہ مولانا بشیر احمد لدھیانویؒ۔
42۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، باب الرسوم السائرہ فی الناس، ص104، عربی، طبع بیروت۔
43۔ گیلانی، مناظر احسن، مولانا، ''احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن''، ص:170، مطبوعہ مکتبہ حمادیہ، کراچی۔
44۔ جار اللہ، موسیٰ، الہام الرحمٰن، ص:136، مطبوعہ حیدر آباد۔
45۔ سندھی، عبید اللہ، مولانا، التمهيد لتعريف آئمة التجديد، عربی ص:24، طبع حیدر آباد۔
46۔ افکارِ سندھی، شعور و آگہی، ص:137، طبع لاہور۔
47۔ سندھی، التمہید، عربی، ص:26، طبع حیدر آباد۔
48۔ مدنی، مولانا، حسین احمد، نقش حیات، ص122، مطبوعہ عزیز پبلیکیشنز، لاہور۔
49۔ ایضاً، ص127۔ 50۔ روح روشن مستقبل، ص62، مطبوعہ لاہور۔
51۔ ایچ۔ بی۔ خان، برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار، ص74 (حاشیہ)، مطبوعہ ادارہ قومی تاریخ و ثقافت، اسلام آباد۔
52۔ سندھی، التمہید، عربی، ص:27، طبع حیدر آباد۔
53۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ، گزٹ، 25 جون 1913ء، ج:13، شمارہ:24، ص:5۔
54۔ سندھی، التمہید، عربی، ص:27، طبع حیدر آباد۔
55۔ ریشمی خطوط سازش کیس، اردو ترجمہ از سید محمد میاں صاحبؒ، ص:268,267، طبع لاہور۔
56۔ ایضاً، ص:272,271۔
57۔ جوہر، محمد علی، مولانا، آپ بیتی اور فکری مقالات، ص:46، طبع لاہور۔
58۔ ریشمی خطوط سازش کیس کی ڈاریکٹری، ص:450، طبع لاہور۔
59۔ تقریظ مولانا سید محمد سلیمان ندویؒ، قرآن عزیز، ص12، مطبوعہ انجمن خدام الدین، لاہور
60۔ بنوری، مولانا، محمد یوسف، یتیمۃ البیان مقدمۃ مشکلات القرآن، ص44، مطبوعہ مجلس علمی، ڈھابیل، ہندوستان۔
61۔ ایضاً۔

www.rahimia.org

**مطالعۂ حدیث و فقه**

# استحسان بالاثر کی اجتہادی حیثیت

# (ایک اطلاقی مطالعہ)

تحریر: پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن

## استحسان کا لغوی مفہوم

استحسان، حسن سے **استفعال** کے وزن پر ہے، اس کا لغوی معنی ہے ''کسی چیز کو اچھا خیال کرنا اور گردانا''، یہ استقباح (کسی چیز کو برا تصور کرنا) کی ضد ہے، جیسے کوئی شخص کہے **استحسنته** یعنی میں اس کو اچھا خیال کرتا ہوں۔ اسی طرح یہ جملہ استعمال ہوتا ہے، **استحسن الرأی او القول او الطعام او الشراب** یعنی رائے کو یا قول کو یا کھانے پینے کو اچھا سمجھتا ہوں۔ اسی نوعیت کا یہ مقولہ ہے **هذا استحسنه المسلمون** یعنی اس بات کو مسلمان اچھا گردانتے ہیں۔(1)

یا استحسان کا مفہوم یہ ہے

**"طلب الاحسن للاتباع الذی هو ما مور به"(2)**

یعنی ''بہترین بات کی جستجو اس کی اتباع کے نقطۂ نظر سے جس کا حکم دیا گیا ہے''،

جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (3) (آپ ان میرے بندوں کو خوشخبری دے دیجئے، جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے عمدہ پہلو کی پیروی کرتے ہیں اور یہی لوگ جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی لوگ اہل دانش ہیں)

یہاں یہ واضح رہے کہ استحسان کے لفظ کے استعمال سے متعلق کوئی نزاع نہیں ہے(4) کیوں کہ یہ لفظ قرآن و حدیث اور اہل لغت کے ہاں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً قرآن حکیم میں وارد ہے: وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (اس وحی کے بہترین پہلو کی جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی، پیروی کرو)

حدیث موقوف میں ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: **مارآه المسلمون حسناً فهو عندالله حسن۔(6)** (جس کو مسلمان اچھا جانیں تو وہ اللہ کے ہاں اچھی ہے)

اسی طرح عربی لغت و اسلامی فقہ کے ماہر امام شافعی نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے، مثلاً ان کا قول ہے:

www.rahimia.org

**استحسن فی المتعة ان تکون ثلاثین درهما و استحسن ثبوت الشفعة للشفیع الی ثلاثة ایام، واستحسن ترک شیء للمکاتب من نجوم الکتابة. (7) واستحسن ان یضع اصبعیه فی صماخی اذنیه اذا اذن. (8)**

(میں متعہ (طلاق یافتہ عورت کو دیئے جانے والے کپڑے) کی بابت یہ بہتر خیال کرتا ہوں کہ وہ تیس درہم کا ہو، میں شفعہ کرنے والے کے لیے تین دن تک شفعہ کے ثبوت کے حق کو بہتر سمجھتا ہوں اور اس بات کو اچھا جانتا ہوں کہ مکاتب (جس غلام کو اس کا آقا مقررہ مدت میں مقررہ رقم پر آزاد کرنے کا وعدہ کرتا ہے) کے لیے کتابت (معاوضہ) میں سے کچھ قسطیں چھوڑ دی جائیں اور اچھا سمجھتا ہوں کہ جب کوئی اذان دے تو وہ اپنی اُنگلیاں، اپنے کانوں کے اندر ڈال لے)

اموی دور کے مشہور و معتبر قاضی ایاس بن معاویہ نے بھی اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے کہا:

**قیسوا القضاء ما صلح الناس، فاذا فسدوا فاستحسنوا.(9)**

(جب تک لوگوں کے فائدے میں ہو، قضا میں قیاس کرو، اور جب لوگوں میں فساد آجائے تو استحسان کرو)

## استحسان کا اصطلاحی مفہوم

اصطلاحی مفہوم میں امام ابوحنیفہ اور ان کے مدرسہ فکر کے فقہاء نے طریقہ استحسان اور اس کی بنیاد پر استنباطِ مسائل کا سب سے زیادہ کام کیا اور قیاسِ ظاہر میں غلو کی وجہ سے مصلحت عامہ میں جب کوئی مشکل پیش آئی ہے، تو استحسان کے ذریعہ استنباط کر کے ان فقہاء نے انتہائی انصاف اور اعتدال پر مبنی مہارت فن کا ثبوت دیا ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم کمالی نے (Aghnides) کا اس حوالہ سے یہ قول نقل کیا ہے: (10)

**The fact is that he (Abu Hanifah) used the word Istihsan in its usual meaning namely that of abondoning qias for an opinion thought to be more subseruient to the social interest.**

(حقیقت یہ ہے کہ ابوحنیفہ نے استحسان کا لفظ عام معنوں میں یعنی ترک کردہ قیاس کے مقابلہ میں اجتماعی مفاد کے لیے زیادہ مفید سوچی گئی رائے کے لیے استعمال کیا ہے)

اسی بنا پر امام محمد بن حسن شیبانی نے استحسانی مسائل سے واقفیت کو دیگر معتبر دلائل کی طرح شرائطِ اجتہاد میں سے شمار کیا ہے۔ چنانچہ ان کا قول ہے:

www.rahimia.org

**من كان عالماً بالكتاب والسنة و بقول اصحاب رسول الله عليه صلى الله عليه وسلم و بما استحسن فقهاء المسلمين وسعه ان يجتهد رأيه فيما يبتلى به و يمضيه فى صلاته و صيامه و حجه و جميع ما امر به و نهى عنه.(11)**

(جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ، اقوالِ صحابہؓ رسول اور مسلم فقہاء کے استحسانی مسائل کا علم رکھنے والا ہو، اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ اپنے رائے سے ان معاملات میں اجتہاد کرے، جو اسے درپیش ہوں اور نماز، روزہ، حج اور تمام ماموراتِ وممنوعات میں اس پر عمل کرے)

معروف حنفی فقیہ شمس الائمہ سرخسی نے استحسان کی وضاحت دو طرح سے کی ہے۔(12)

استحسان کی پہلی صورت ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

**العمل بالاجتهاد و غالب الرأى فى تقدير ما جعله الشرع موكولا الى ارائنا.**

''ان معاملات میں جن میں شریعت نے اندازہ ہماری آراء کے حوالہ کردیا، ان میں اجتہاد اور غالب رائے پر عمل کرنا''

جیسے قرآن حکیم نے ان طلاق یافتہ عورتوں کے بارہ میں جن کو رخصتی سے قبل طلاق ہوجائے اور ان کا مہر بھی مقرر نہ ہوا ہو، یہ حکم دیا ہے کہ ان کو معروف طریقہ سے ''متعہ'' یعنی کپڑوں کا جوڑا دے دیا جائے۔ اس معاملہ میں کپڑوں کی نوعیت اور مالیت کا تعین ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اب اس سلسلہ میں صحیح اندازہ تک پہنچنے کے لیے جو کوشش (اجتہاد) کی جائے گی، اس پر عمل درآمد استحسان کہلائے گا۔

جب کہ استحسان کی دوسری صورت کو انھوں نے یوں بیان کیا ہے:

**هو الدليل الذى يكون معارضا للقياس الظاهر الذى تسبق اليه الا وهام قبل امعان التأمل فيه، و بعد امعان التأمل فى حكم الحادثة و اشباهها من الاصول يظهر ان الدليل الذى عارضه فوقه فى القوة، فان العمل به هو الواجب.**

''یعنی استحسان وہ دلیل ہے جو ایسے قیاسِ ظاہر کے خلاف ہو، جس کی جانب گہرے غور وفکر سے قبل خیالات جاتے ہیں، لیکن درپیش مسئلے اور اس سے ملتے جلتے اصول میں گہرے غور وفکر سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ وہ دلیل جو اس کے خلاف ہے وہ قوت میں اس (قیاسِ ظاہر) سے بڑھ کر ہے، تو ایسی صورت میں اس پر عمل کرنا ضروری ہے''۔

اس سے اس جانب رہنمائی ہوتی ہے کہ استحسان محض رائے زنی یا خواہشات کے مطابق شرع سازی نہیں ہے، نہ ہی محض ذوق اور موافق طبع چیز کا نام ہے۔ وہ تو ضابطہ کی بنیاد پر یا قیاس کی علت کی عدم موجودگی کی وجہ سے کسی درپیش مسئلے میں عمومی ضابطہ اور قیاس کو ان شرعی دلائل کی بنا پر ترک کرنا ہے، جن میں کوئی نزاع نہیں ہے۔

www.rahmia.org

استحسان کی سند اور دلیل درحقیقت ان مصالح کی رعایت ہے، جن کی شرعی نصوص تائید کرتی ہیں، خواہ یہ تائید کسی مخصوص نص کے ذریعہ ہو یا کسی متعین نص کی علت کی بنا پر ہو یا ایک مفہوم کی کئی نصوص کی علت کی وجہ سے ہو۔

استحسان کا مرجع عام ضابطہ یا خالص قیاس کے مقابلہ میں جزوی مصلحت پر عمل ہے اور اس مصلحت کی معرفت کبھی نص سے حاصل ہوتی ہے اور کبھی اس تک فقیہ ایسے مؤثر اور مخفی علت کے ذریعہ پہنچتا ہے، جو شریعت کے تصرفات کے موافق ہوتی ہے اور کبھی قواعد سے استثناء میں ضروری اور لازمی خارجی مصالح کے اعتبار کا ضابطہ اس جانب رہنمائی کرتا ہے۔(13)

درحقیقت استحسان شرعی نصوص، اجماع، قیاس کے علاوہ مقاصد شریعت پر مبنی ہوتا ہے، یوں وہ شریعت کے عمومی اصول وقواعد کے ماتحت ہے۔ مثلاً عام اسلامی ضوابط یہ ہیں:

(۱) لاضرر و لاضرار (14) (نہ خود نقصان اُٹھاؤ اور نہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچاؤ)

(۲) الضرورات تبیح المحظورات (15) (ضرورت اور مجبوری ممنوع چیزوں کو جائز کردیتی ہے)

(۳) المشقة تجلب التیسیر (16) (مشقت آسانی مہیا کرتی ہے)

اس لیے مشہور حنفی فقیہ ابوبکر رازی جصاص کا یہ کہنا درست ہے کہ جن معاملات کے بارہ میں ہمارے علماء استحسان کے قائل ہوئے ہیں، وہ تمام دلائل اور اصول پر مبنی ہیں، ان میں سے کسی چیز میں ان کی خواہش اور ذاتی رجحان نہیں پایا جاتا۔(17)

## استحسان کی قسمیں اور استحسان بالاثر

سند کے لحاظ سے استحسان کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً استحسان بالاثر، استحسان بالاجماع، استحسان بالقیاس، استحسان بالضرورۃ، استحسان بالمصلحہ اور استحسان بالعرف، ان میں سے اول الذکر کے علاوہ تمام اقسام کو استحسان کے حقیقی دائرہ میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ استحسان بالاثر کی تعریف یہ ہے:

**هو العدول عن حكم القياس فى مسألة الى حكم مخالف له ثبت بالكتاب أو بالسنة أو بقول الصحابى.(18)**

(کسی مسئلہ میں قیاس کے حکم سے اس کے برعکس حکم کی طرف عدول کرنا جو قرآن یا سنت یا قولِ صحابی سے ثابت ہو)

استحسان بالاثر پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس پر استحسان کا اطلاق درست نہیں، کیوں کہ یہاں حکم اثر یا نص سے ثابت شدہ ہے۔ چنانچہ عصر حاضر کے سکالر استاذ مصطفیٰ زرقا کہتے ہیں:(19)

**الاستحسان المقصود انما هو عدول من الفقيه المستنبط عن حكم القياس حيث**

www.rahimia.org

**یجوز القیاس لفقدان النص التشریعی، وان القرآن ثم السنة ثم الاجماع مصادر ثلاثة اساسیة مقدمة فی الرتبه علی القیاس فلامجال لقیاس ولا استحسان الا فیما لم یرد من الاحکام فی أحد تلک المصادر الثلاثیة.**

''ایسا فقیہ جو استنباط کی صلاحیت کا حامل ہے، جس جگہ شرعی نص نہ ہونے کی بناء پر قیاس کی اجازت ہے، جب قیاس کے حکم سے عدول کرتا ہے تو یہ استحسان کہلاتا ہے، اس لیے کہ قرآن، سنت اور اجماع جیسے تین بنیادی ماخذ میں وارد شدہ احکام میں قیاس اور استحسان کی کوئی گنجائش نہیں''۔

وہ مزید کہتے ہیں:

**ان ماورد به النص منحرفا عن قیاس امثاله لمصلحة لحظها الشارع الآمر، انما هو فی الحقیقة استحسان الشارع و لیس الکلام فیه، وانما الکلام فی استحسان الفقیه المستنبط الذی یطبق نصوص الشارع، و یقیس علیها و یستحسن علی وفقها من غرض الشارع و مقاصد الشریعة.**

''یقیناً جہاں شارع نے کسی مصلحت کے پیش نظر کسی نص میں قیاس سے انحراف کیا ہے، وہ درحقیقت استحسانِ شارع ہے، جو کہ موضوع بحث نہیں، کلام تو اس فقیہ کے استحسان کے بارہ میں ہے، جو استنباط کی صلاحیت رکھتا ہے اور شارع کی نصوص میں تطبیق دے سکتا ہے، اور ان پر قیاس کرتا ہے، اور شارع کی غرض اور مقاصد شریعت کی روشنی میں ان نصوص کے موافق استحسان کرتا ہے''۔

گویا ان کے نزدیک ایسا فقیہ جو استنباط کی صلاحیت کا حامل ہے اور جو شارع کی غرض اور شریعت کے مقاصد سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے نصوص کو ہم آہنگ کرتا ہے، ان پر قیاس کرتا ہے اور ان کے مطابق استحسان کرتا ہے، جب شرعی نص نہ ہونے کے بنا پر ایسے مقام پر جہاں قیاس کی اجازت ہے، قیاس کے حکم سے عدول کرتا ہے تو وہ واستحسان کہلاتا ہے، اس لیے قرآن، سنت اور اجماع جیسے بنیادی ماخذ میں وارد شدہ احکام میں قیاس اور استحسان کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اگر شارع نے کسی مصلحت کے پیش نظر کسی نص میں قیاس سے انحراف کیا ہے تو وہ استحسانِ شارع ہے جو کہ موضوعِ بحث نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ استحسانِ شارع بھی درحقیقت استحسان کی اس حوالہ سے قسم ہے کہ وہاں مجتہد کی نظر میں شارع نے اپنی اجتہادی حیثیت سے مسائل کا حکم بتایا ہے اور معقولیت معنی کو پیش نظر رکھا ہے اور معقول المعنی نصوص ہی قیاس کی بنیاد بنتی ہیں۔ تاہم غیر معقول المعنی نصوص نہ تو قیاس کے دائرہ میں آتی ہیں، اور نہ ہی وہاں استحسان کا اطلاق حقیقی معنوں میں ہوگا، اس لیے استحسان کی بحث میں شارع کا وہی استحسان اصولاً زیر بحث ہوگا جو معقول المعنی ہوگا اور جو دیگر مجتہدین کے استحسان کی بنیاد ثابت ہوگا۔

اسی طرح جب مجتہد، نصوص شریعت کی تطبیق دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں وہ اپنے اجتہاد سے کام لیتا ہے۔ یوں اس سے استحسان کا صدور بھی ہوتا ہے، اس طرح استحسان بالاثر میں وہ اُمور بھی شامل ہیں، جہاں مجتہد نے آثار و نصوص کو تطبیق دی ہے یا ان کے اشارہ، دلالۃ یا اقتضاء سے استدلال کیا ہے۔

علاوہ ازیں جب نصوص کے مدلولات ظنی ہوں تو وہ یقیناً اجتہاد کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہاں استحسان کے عمل دخل سے انکار ممکن نہیں۔ لہٰذا استحسان بالاثر پر اطلاق محض مجاز نہیں۔

علاوہ ازیں استحسان کی تعریف میں جب حکم قیاس سے عدول و انحراف کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس سے مراد محض اصطلاحی قیاس سے انحراف نہیں ہوتا، بلکہ عام شرعی نص اور عمومی قاعدہ و ضابطہ بھی اس ضمن میں شامل ہوتے ہیں۔

لہٰذا استاد مصطفیٰ زرقا کے نقطۂ نظر کے مطابق استحسان کا اطلاق محض استحسان بالقیاس پر ہوتا ہے جو کہ استحسان کی ایک محدود تعبیر ہے۔ جب کہ استحسان بالاثر کا اطلاق یہاں دو حوالوں سے پیش نظر ہے:

۱۔ مجتہد کی نظر میں شارع کا عام نص یا قاعدے سے معقول المعنی بنیاد پر انحراف۔

۲۔ مجتہد کا نصوص کے اشارہ، دلالۃ وغیرہ سے استدلال کرتے ہوئے قیاس سے انحراف۔

اس طرح استحسان بالاثر کی تین اقسام وجود میں آجاتی ہیں:

۱۔ **استحسان بالکتاب:** کہ مجتہد قرآن کے اشارہ، دلالۃ وغیرہ سے استدلال یا نص میں تاویل و تخصیص وغیرہ کی بنیاد پر قیاس کے حکم سے عدول کرے۔

۲۔ **استحسان بالسنہ:** کہ مجتہد کی نظر میں شارع، عام نص یا قاعدے کے حکم سے مصلحہ یا دفع ضرر کی بنیاد پر عدول کرے یا یہ کہ مجتہد، سنت کے اشارہ، دلالۃ وغیرہ سے استدلال یا نص میں تاویل و تخصیص وغیرہ کی بنیاد پر قیاس کے حکم سے عدول کرے۔

۳۔ **استحسان بقول الصحابی:** کہ صحابی عام نص یا قاعدے کے حکم سے مصلحہ یا دفع ضرر کی بنا پر عدول کرے، تاہم جن حضرات نے قیاس یا عام قاعدے وغیرہ کے حکم سے قرآن کی عبارۃ النص یا حدیث کی غیر معقول المعنی عبارۃ النص کی طرف عدول کو استحسان قرار دیا ہے، وہ بہر حال مجاز ہے کہ ان دونوں صورتوں میں مجتہد کے استنباط کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اس امر کی وضاحت کے بعد استحسان بالاثر بھی حقیقی معنوں میں استحسان کی ایک قسم ہے۔

## استحسان بالاثر پر مبنی چند فقہی مسائل

مناسب ہوگا کہ ان چند فقہی مسائل کی نشاندہی کی جائے جو استحسان بالاثر پر مبنی ہیں، نیز ان میں قیاس (عام قواعد و عام نصوص سمیت) اور آثار کے تقاضوں کا موازنہ کر کے نظریہ استحسان کو کام میں لایا جائے۔

www.rahimia.org

## ا۔ جس چیز پر ٹھوس نجاست موجود ہو، اسے زمین سے رگڑ کر پاک کیا جاسکتا ہے:

اگر موزے وغیرہ کو ٹھوس نجاست لگ جائے، جیسے گوبر، انسانی غلاظت وغیرہ اور یہ نجاست خشک ہوجائے تو اس کو زمین سے رگڑنے سے وہ پاک ہوجائے گا۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کا قول ہے۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے اور یہ امام محمد اور امام زفر کا قول ہے کہ موزے پاک نہ ہوں گے کیوں کہ موزہ میں نجاست کے جو اجزاء داخل ہوگئے ہیں، وہ خشک ہونے اور زمین کے رگڑنے سے دور نہیں ہوسکتے، جیسے کپڑا وغیرہ اس طریقے سے پاک نہیں ہوتا۔ اس استحسان کی بنیاد حدیث ہے:

**اذا وطی الأذی بخفیه فطهورهما التراب (20)**

(کہ اگر موزوں کو اذیت والی چیز یعنی نجاست لگ جائے تو وہ انہیں زمین سے رگڑ لے کیوں کہ زمین ان دونوں کو پاک کرنے والی ہے)

مجتہد کی نظر میں شارع علیہ السلام نے اس مخفی علت کی بنیاد پر استحسان کیا ہے کہ چمڑے کی سختی کی وجہ سے بہت کم اجزائے نجاست اس میں داخل ہوتے ہیں۔ اور جو اجزاء موجود ہوتے ہیں، وہ زمین کے ساتھ رگڑنے سے زائل ہوجاتے ہیں، چنانچہ علامہ مرغینانی کہتے ہیں:

**ان الجلد لصلابته لایتداخله أجزاء النجاسة، الاقلیل ثم یجتذبه الجرم اذا جف، فاذا أزال زال ماقام به (21)**

امام ابو یوسف سے مروی ایک روایت کے مطابق اگر تر نجاست (جیسے گوبر اور غلاظت وغیرہ) کو بھی زمین سے رگڑ کر اس طرح صاف کرلیا جائے کہ اس کا اثر باقی نہ رہے تو وہ چیز پاک ہوجائے گی، اس لیے کہ لوگوں کا ابتلائے عام ہے اور مندرجہ بالا حدیث کے الفاظ بھی عام ہیں۔(22)

## ۲۔ نماز میں حدث پیش آنے کی صورت میں دوبارہ وضو کر کے بنا کی جاسکتی ہے:

نماز میں اگر کوئی حدث پیش آجائے یعنی ناقض وضوء سبب پیش آجائے تو اسی وقت نماز سے نکل جائے، اگر امام ہے تو کسی کو قائم مقام بنادے اور وضو کر کے وہیں سے شروع کردے، جہاں سے نماز منقطع ہوئی۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے اور یہ امام شافعی کا قول ہے کہ نئے سرے سے نماز ادا کی جائے۔ اس لیے کہ حدث، نماز کے منافی ہے اور چلنا پھرنا اور منہ پھیرنا نماز کے خاتمے کا باعث ہیں، یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی نماز میں جان بوجھ کر وضو توڑنے والا عمل کرے۔(23)

اس استحسان کی بنیاد درج ذیل حدیث ہے:

**من اصابه قیئ أو رعاف أو قلس أو مذی فلینصرف فلیتوضأ ثم لیبن علی صلاته وهو فی ذالک لا یتکلم (24)**

www.rahimia.org

(نماز کے دوران جس نے قے کی یا اس کی نکسیر پھوٹ گئی یا معدے سے منہ میں کوئی چیز آ گئی یا مذی آ گئی تو اسے چاہئے کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے، وضو کرے اور نماز وہیں سے شروع کرے جہاں سے منقطع ہوئی، بشرطیکہ اس نے اس دوران گفتگو نہ کی ہو)

گویا یہاں مجتہد کی نظر میں شارع علیہ السلام نے رفع حرج (تکلیف کو دور کرنے) اور تیسیر (آسانی) کے اصول کے تحت استحسان کیا کہ انسان بالخصوص مریض کو ان طبعی تقاضوں کے حوالہ سے زیادہ ابتلاء کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا ایسی صورتحال نماز میں پیش آنے کی صورت میں بناء صلوٰۃ (نماز جہاں سے ٹوٹی ہے، وہاں سے دوبارہ شروع کرنے) کی اجازت ہوگی۔

### ۳۔ عشری زمین سے حاصل شدہ شہد میں عشر:

اگر شہد، عشری زمین سے حاصل کیا گیا تو اس پر عشر ہے۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے اور یہ امام شافعی کا قول ہے کہ عشر نہ ہو کیوں کہ یہ ایک جاندار (مکھی) سے پیدا ہوتا ہے اور جانداروں سے پیدا شدہ اشیاء پر عشر نہیں ہوتا، جیسے ریشم پر عشر نہیں کہ وہ بھی ایک جاندار (ریشم کے کیڑے سے حاصل ہوتا ہے، استحسان کی وجہ حدیث نبوی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شہد سے عشر وصول کیا۔(25)

دراصل مجتہد حدیث میں معقولیت معنی تلاش کر لیتا ہے تو اس پر استحسان کا اطلاق کر دیتا ہے کہ شارع نے حکم عشر دیتے ہوئے غالباً اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ مکھی پھولوں اور پھلوں سے رس چوستی ہے اور ان دونوں (پھولوں اور پھلوں) میں عشر ہے تو جو چیز ان سے بنتی ہے (شہد) اس میں عشر آنا چاہئے جب کہ ریشم کا کیڑا پتوں سے غذا حاصل کرتا ہے اور پتوں میں عشر نہیں ہے، لہٰذا اس سے بننے والی چیز (ریشم) میں بھی عشر نہیں۔(26)

### ۴۔ بھول کر کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا:

بھولے سے کھانے پینے کے باوجود روزہ برقرار رہتا ہے۔اس سلسلہ میں قیاس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اس کھانے پینے سے روزہ فاسد ہو جائے، کیوں کہ روزہ کا بنیادی رکن (یعنی اپنے آپ کو مفطرات صوم سے روک کر رکھنا) یہاں قائم نہیں رہا اور جب رکن (بنیاد) ہی موجود نہ ہو تو اصل چیز کیسے باقی رہ سکتی ہے کہ کوئی چیز بھی اپنے منافی چیز کے ساتھ برقرار نہیں رہتی جیسے طہارت، حدث کی موجودگی اور اعتکاف، بلاضرورت مسجد سے باہر نکلنے کی صورت میں باقی نہیں رہتا۔یہی وجہ ہے کہ نماز بھول کر کھانے پینے سے ٹوٹ جاتی ہے۔(27)

لیکن یہاں شارع علیہ السلام نے رفع حرج کے اصول کے تحت استحسان سے کام لیتے ہوئے قیاس سے عدول کیا اور روزہ باقی رہنے کا فیصلہ کیا اور فرمایا:

**من نسی وھو صائم، فاکل او شرب، فلیتم صومہ، فانما اطعمہ اللہ وسقاہ (28)**

(جو بھول گیا کہ وہ روزہ دار ہے اور اس نے کھا لیا یا پی لیا، پس وہ اپنے روزے کو مکمل کرے، اللہ

نے اسے کھلایا اور پلایا)۔

جب کہ نماز کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کیوں کہ اس کی ہیئت ظاہری ہے۔ جو قیام، رکوع، سجود اور قعود وغیرہ پر مبنی ہے اور یہ ہیئت انسان کو یاد دلاتی رہتی ہے کہ وہ نماز میں ہے، اس لیے وہاں بھول کر کھانا پینا غیر معمولی غفلت کا اظہار ہے، جب کہ روزہ کی ہیئت باطنی اور وہ یاد دلانے والی نہیں ہے۔(29)

پھر نماز کی ادائیگی کا وقت محدود ہے، جب کہ روزہ پورے دن پر محیط ہے، جس میں بھولنے کے مواقع زیادہ ہیں، اسی طرح حصولِ طہارت اور عمل اعتکاف ظاہری ہیئت رکھتے ہیں، اس لیے ان پر روزہ کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

**۵۔ پھوپھی، بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بیک وقت ایک شخص کے عقد نکاح میں رہنا درست نہیں:**

کوئی شخص اپنے عقد نکاح میں بیک وقت دو ایسی خواتین کو نہیں رکھ سکتا، جن کے درمیان پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کا رشتہ ہو۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہ ہو کیوں کہ قرآن حکیم میں محرمات کے ذکر کے بعد یہ کہہ کر تمام خواتین سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے:

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (30)

استحسان کی وجہ رسول اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

**لایجمع بین المرأة و عمتها، ولا بین المرأة و خالتها (31)**

اور آپؐ نے یہ استحسان اس مصلحت کی بنیاد پر کیا کہ یہ رشتے صلہ رحمی کے ہیں، جب کہ رشتہ نکاح میں اکٹھا ہونے سے سوکن ہونے کی بنا پر ان میں قطع رحمی پیدا ہوگی، چنانچہ اسی حوالہ سے احناف نے یہ اصول وضع کیا ہے۔

**لایجمع بین امرأتین لو کانت احداھما رجلا لم یجز له ان یتزوج بالأخری (32)**

کہ ایسی دو عورتوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا درست نہیں کہ اگر ان میں سے ایک کو مرد فرض کیا جائے تو اس کے لیے دوسری سے نکاح کرنا درست نہ ہو۔

**٦۔ مرض الموت میں طلاق دینے کی صورت میں بیوی دورانِ عدت وارث ہوگی:**

اگر کوئی شخص، مرض الموت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے اور پھر اس کا انتقال ہوجاتا ہے تو بیوی اس کی وارث ہوگی، بشرطیکہ اس کی عدت مکمل نہ ہوئی ہو۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ وارث نہ ہو کیوں کہ طلاق کی وجہ سے رشتہ زوجیت منقطع ہوچکا ہے، چنانچہ اگر وہ زمانہ صحت میں طلاق دیتا اور عورت کی عدت کے دوران کسی حادثہ کا شکار ہوکر مرجاتا تو اس صورت میں عورت وارث نہ ہوتی۔ یہ مؤقف امام شافعی کا ہے۔

استحسان کی وجہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہے کہ انہوں نے تماضر بنت اصبغ کو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا

www.rahimia.org

وارث قرار دیا تھا، جب انہوں نے مرض الموت میں طلاق دی اور دورانِ عدت انتقال کر گئے تھے۔

اور یہ فیصلہ مصلحت کی بنیاد پر تھا کہ مرض الموت میں ورثا کا حق اپنے مورث کے مال سے متعلق ہوجاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کو ایک تہائی سے زائد مال کی وصیت کرنے سے منع کر دیا گیا ہے اور بیوی بھی ورثاء میں سے ہے، جس کا حق شوہر کے مال سے وابستہ ہوگیا ہے اور اب وہ اس کو اس کے حق سے محروم کرنا چاہتا ہے، لہٰذا یہ عمل نافذ نہیں ہوگا اور عدت کی شرط اس بنا پر ہے کہ یہ گزشتہ نکاح کے اثرات میں سے ہے، اسی وجہ سے وہ اس دوران دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔

صحابہ کرام میں سے یہی مؤقف حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کا ہے۔(33)

بعض حضرات کے ہاں یہ استحسان بالاجماع کی مثال ہے، لیکن امام شافعی کے اختلافِ رائے کا سبب اس کو استحسان بالاجماع کی مثال قرار دینا درست نہیں۔

یہاں مرض سے مراد وہ صورت ہے، جس میں ہلاکت کا اندیشہ غالب ہو، جیسے کوئی صاحب فراش ہو اور اپنی ضروریات پوری کرنے سے صحیح طور پر قادر نہ ہو۔ یا وہ شخص جو میدان میں مبارزت (دوبدو لڑائی) کے لیے نکلتا ہے یا وہ شخص جس کو قضا یا رجم میں قتل کے لیے لایا جاتا ہے۔ تاہم کوئی قلعہ میں محصور ہو یا جنگ کی صف میں ہو تو اس حالت میں اس کی طلاق، طلاق الفار (بھگوڑے کی طلاق) شمار نہیں ہوگی۔(34)

اس سلسلہ میں علامہ مرغینانی کہتے ہیں:

**ان الزوجية سبب ارثها فى مرض موته، والزوج قصد ابطاله، فيرد عليه قصده بتاخير عـمـله الى زمان انقضاء العدة دفعا للضرر عنها، وقد امكن، لان النكاح فى العدة يبقى فى حق بعض الآثار فجاز ان يبقى فى حق ارثها عنه (35)**

## ۷۔ جرم زنا کے ثبوت کے لیے مجرم کا چار مرتبہ اقرار ضروری ہے:

جرم زنا کے لیے چار مرتبہ اقرار ضروری ہے ورنہ جرم ثابت نہیں ہوگا۔ اور حد نافذ نہیں کی جائے گی۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے اور یہ امام شافعی کا قول ہے، کہ ایک مرتبہ اقرار کافی ہو، جیسا کہ دیگر تمام معاملات میں ایک مرتبہ اقرار پر ہی فیصلے صادر کئے جاتے ہیں۔

استحسان کی وجہ حدیث ماعز رضی اللہ عنہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس وقت تک سزا نافذ نہیں کی جب تک کہ ان کی جانب سے چار مرتبہ اقرار نہیں کیا گیا۔(36)

گویا مجتہد کی نظر میں شارع علیہ السلام نے اقرار کو شہادۃ پر قیاس کر کے استحسان کیا ہے کہ جس طرح چار گواہوں کی عینی شہادت کے بغیر جرم زنا ثابت نہیں ہوتا اسی طرح چار اقراروں کے بغیر جرم زنا ثابت نہیں ہوگا کہ جب اس معاملہ میں شہادت کا نصاب عام معمول سے ہٹ کر ہے تو اقرار کا نصاب بھی معمول سے ہٹ کر ہوگا۔

www.rahimia.org

علامہ مرغینانی کہتے ہیں:

**ان الشهادة اختصت فيه بزيادة العدد، فكذا الاقرار اعظاما لأمر الزنا، و تحقيقا لمعنى الستر (37)**

## ۸۔ تیسری مرتبہ چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا:

ایک شخص نے چوری کا ارتکاب کیا تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا، دوسری مرتبہ چوری پر اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا گیا، اب اگر یہ شخص تیسری مرتبہ چوری کا ارتکاب کرے گا تو اس کا بایاں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

قیاس کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے کہ اس نے قابل حد، چوری کے جرم کا ارتکاب کیا ہے، جیسے گزشتہ چوریوں پر اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دیا گیا تھا۔ اور یہ امام شافعی کا مؤقف ہے۔

استحسان کی بنیاد حضرت علی کرم اللہ وجہ کا قول ہے، جس میں انہوں نے مصلحت کو پیش نظر رکھا کہ بائیں ہاتھ کو جسم سے علیحدہ کرنے کی صورت میں وہ شخص ہاتھوں سے کام لینے کی صلاحیت سے بالکلیہ محروم ہوجائے گا۔ اور اسے حرج و تنگی پیش آئے گی اور حد کا مقصد تنبیہ کرنا ہے، کسی چیز کو تلف کرنا نہیں ہے، چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہ کا ارشادِ گرامی ہے:

**انی لأستحی من الله تعالیٰ ان الا ادع لها يدا ياكل بها و يستنجى بها، ورجلا يمشى عليها (38)**

(مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ میں اس چور کا ایک بھی ہاتھ نہ چھوڑوں کہ وہ اس سے کھانا کھا سکے اور استنجاء کر سکے اور ایک پاؤں بھی نہ چھوڑوں کہ وہ چل سکے)۔

اس کے علاوہ ایسی صورت کم ہی وقوع پذیر ہوتی ہے اور تنبیہ ایسے امور میں ہوتی ہے جو زیادہ وقوع پذیر ہوں۔

علامہ مرغینانی زیر بحث مسئلہ میں کہتے ہیں:

**انه اهلاک معنى لما فيه من تفويت جنس المنفعة، ولانه نادر الوجود، والزجر فيما يغلب (39)**

''معنوی طور پر یہ اہلاک (ہلاک کرنا) کی صورت ہے، کیوں کہ اس میں جنس منفعت کو فوت کر دینا ہے، علاوہ ازیں ایسی صورت کم ہی وقوع پذیر ہوتی ہے، اور تنبیہ ایسے امور میں ہوتی ہے، جو زیادہ وقوع پذیر ہوں''۔

علامہ مرغینانی نے اس پر اجماع کے انعقاد کا ذکر کیا ہے۔ مگر امام شافعی کے اختلاف کے سبب اس مثال کو استحسان بالاجماع کے ضمن میں ذکر نہیں کیا گیا۔

www.rahimia.org

## ۹۔ مالی جرمانہ کی سزا دینے کی اجازت ہے:

اسلامی حکومت یا ادارے کے لیے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ کسی قانون یا ضابطے کی خلاف ورزی پر اس کے مرتکب شخص سے کوئی متعینہ رقم بطورِ جرمانہ وصول کرے۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ رقم کی وصولی درست نہ ہو کیوں کہ کسی شخص کا مال اس کی رضا مندی کے بغیر لینا درست نہیں ہے۔

استحسان کی وجہ حدیث نبوی اور آثارِ صحابہ ہیں، جن میں آپ نے اور صحابہ نے جرائم پیشہ لوگوں کو جرائم سے باز رکھنے کے لیے مالی جرمانہ کی وصولی کی اجازت دی ہے، گویا آپ نے مصلحت کی بنیاد پر استحسان کیا۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

**من اعطاها موتجرا فله اجرها ومن منعها فانا آخذوها و شطر ماله غرمة من غرمات ربنا ليس لآل محمد منها شيء (40)**

(جو شخص اپنا مال اجر کی نیت سے دے گا تو اس کے لیے اس کا اجر ہے اور جو زکوٰۃ کی ادائیگی سے باز رہا تو میں وہ بھی وصول کروں گا اور اس کے مال کا کچھ حصہ بھی بطورِ تاوان لوں گا جو ہمارے پروردگار کی جانب سے ہوگا تاہم اس میں سے کچھ بھی میرے آل کے لیے حلال نہیں ہوگا)

چنانچہ حضرت عمر فاروق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے زکوٰۃ نادہندہ افراد سے مالی جرمانہ وصول بھی کیا۔

اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے اس شخص پر تاوان دوگنا کر دیا تھا، جس نے درختوں پر لگے پھلوں کی چوری کی تھی، اسی طرح اس شخص پر جس نے مویشیوں کو اپنے مخصوص جگہ (مراح) پہنچنے سے قبل چوری کر لیا تھا۔

نیز آپ نے حرمِ مدینہ میں شکار کرنے والے کے سامان کو اس شخص کے لیے مباح قرار دیا جو اسے حاصل کر لے۔

علاوہ ازیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان بھوکے غلاموں کے آقا پر تاوان دوگنا کر دیا تھا، جنھوں نے ایک اَعرابی (دیہاتی) کی اونٹنی چوری کی تھی، اسی طرح اس شخص سے دوگنا تاوان وصول کیا، جس نے راستے میں پڑی گمشدہ چیز کو چھپا لیا تھا۔(41)

## ۱۰۔ حالت جنگ میں اہل حرب کو خوراک اور کپڑے فراہم کرنا درست ہے:

حالتِ جنگ میں اہل حرب کو خوراک اور کپڑے فراہم کرنے کی اجازت ہے۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ جیسے اہل حرب کو اسلحہ کی فراہمی کی اجازت نہیں ہے، اسی طرح خوراک اور کپڑوں کا فراہم کرنا درست نہ ہو، کیوں کہ اس طرح انہیں تقویت حاصل ہوگی اور وہ مسلمانوں کے خلاف آمادہ جنگ ہوں گے۔

www.rahimia.org

استحسان کی وجہ سے حدیث ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت ثمامہ کو حکم دیا کہ وہ اہل مکہ کو خوراک فراہم کریں، حالانکہ یہ لوگ آپ کے مقابلہ میں حالت جنگ میں تھے، واضح رہے کہ جب کفارِ مکہ نے ثمامہ کو طعنہ دیا تھا کہ وہ صابی ہو گیا ہے تو ثمامہ نے حلفیہ کہا کہ وہ صابی نہیں ہوئے بلکہ اسلام قبول کر لیا ہے اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ بخدا اب تمہارے پاس یمامہ سے ایک دانہ نہیں آئے گا، چنانچہ اپنے شہر جا کر غلہ بھیجنے سے منع کر دیا۔ یہاں تک کہ قریش نے آپ سے رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہا کہ آپ ثمامہ کو حکم دیں کہ وہ ان کا راستہ چھوڑ دے، اس پر آپ ؐ نے ثمامہ کو مذکورہ بالا حکم دیا۔ (42)

مجتہد کی نظر میں شارع علیہ السلام نے انسانی مصلحت کی بنیاد پر استحسان کیا کہ دنیا کا ہر انسان ضروریاتِ زندگی کا استحقاق رکھتا ہے اور یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لی ہے کہ وہ کافر کو بھی متاعِ قلیل (متاعِ دنیا) دے گا، چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اہل ایمان کے لیے رزق کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٢٦﴾ (43)

''اور جو کفر کرے اس کو بھی نفع پہنچاؤں گا تھوڑے دنوں، پھر اس کو جبراً بلاؤں گا دوزخ کے عذاب میں اور وہ بری جگہ ہے رہنے کی''۔

## ۱۱۔ بیع العینہ درست نہیں:

کسی شخص نے ایک ہزار روپے نقد یا اُدھار پر ایک چیز فروخت کی اور خریدار نے اس کو اپنی تحویل میں لے لیا پھر وہ خریدار سے رقم وصول کرنے سے قبل اسے پانچ سو روپے میں خرید لیتا ہے تو یہ درست نہیں ہے۔ اس کو اصطلاح میں **بیع العینہ** کہا جاتا ہے۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے اور یہ امام شافعی کا قول ہے کہ دوسری بار کی خرید و فروخت بھی درست ہے، اس لیے کہ خریدار کی ملکیت قبضہ کی وجہ سے مکمل ہو چکی تھی، اب اس کا پرانے فروخت کنندہ یا کسی اور کو فروخت کرنا درست ہے، یہ معاملہ ایسا ہی ہے جیسے وہ اس چیز کو اسی قیمت پر یا زائد قیمت پر یا سامان کے بدلہ میں فروخت کنندہ کو فروخت کر دے تو وہ درست ہے۔

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک خاتون نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے ایک چیز آٹھ سو کی خرید کر انہیں چھ سو میں بیچ دی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تم نے بری خرید و فروخت کی اور زید بن ارقم تک پیغام پہنچا دو کہ اگر انہوں نے توبہ نہ کی تو اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ادا کردہ ان کے حج اور جہاد کو ضائع کر دے گا۔ (44)

اس کی وجہ علامہ مرغینانی نے یہ بتائی:

**ان الثمن لم يدخل فی ضمانه، فاذا وصل اليه البيع و وقعت المقاصة، بقى له فضل**

**خمس مائة، و ذالک بلا عوض (45)**

"کہ ثمن (طے کردہ قیمت) فروخت کنندہ کے ضمان میں داخل نہیں ہوا اور جب چیز اس کے پاس واپس پہنچی اور دونوں معاملات میں طے شدہ قیمتوں کا باہمی تقابل ہوا تو اس کے لیے بغیر کسی عوض کے پانچ سو روپے زائد ہو گئے"۔ گویا اس نے ایسی چیز کا نفع حاصل کیا، جس کا وہ ضامن نہیں اور یہ درست نہیں، جب کہ کسی اور کو بیچنے کا معاملہ اس سے مختلف ہے کہ وہاں نفع پہلے فروخت کنندہ کو حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ اسی طرح مساوی قیمت پر فروخت کرنے کا معاملہ بھی اس سے علیحدہ ہے کہ وہاں سود موجو نہیں ہے، اسی طرح زائد قیمت پر فروخت کرنے کا معاملہ اس لیے مختلف ہے کہ وہاں نفع خریدار کو اس صورت میں حاصل ہو رہا ہے کہ فروخت شدہ چیز اس کے ضمان میں آ چکی ہے، اسی طرح سامان کے بدلہ میں فروخت کرنا بھی درست ہے کہ یہاں ثمن کی جنس مختلف ہو گئی اور ان میں مماثلت نہیں رہی۔

مجتہد کی نظر میں حضرت عائشہ نے اجتہاد کرتے ہوئے سد ذریعہ پر مبنی مصلحت کی بنیاد پر استحسان کیا کہ اس میں سود کا شائبہ پایا جا رہا ہے اور قرض دینے والے اپنا قرض وصول کرنے کے نام پر اپنی اشیاء مہنگی فروخت کر کے سستی خرید کر مقروضوں کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، اس لیے اس کا انسداد ضروری ہے۔

**۱۲۔ مشترکہ ملکیت سے استفادہ کے لیے باری مقرر کرنا درست ہے:**

ایک چیز ایک سے زائد مالک ہونے کی صورت میں ان کا باہمی اتفاق سے اس کو باری باری استعمال کرنا "مہایاۃ" کہلاتا ہے، جو کہ جائز اور درست ہے۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ درست نہ ہو کہ یہ منفعت کا اسی جیسی منفعت سے تبادلہ کا نام ہے، اس لیے کہ ہر شریک اپنے باری میں اپنے دوسرے شریک کی ملکیت سے اس کے بدلہ میں فائدہ اُٹھاتا ہے کہ دوسرا شریک اس کی ملکیت سے اپنی باری میں فائدہ اُٹھائے گا اور منفعت کا اس جیسی منفعت سے تبادلہ درست نہیں کہ وہ مال نہیں۔

استحسان کی وجہ قرآن حکیم کی یہ آیت ہے:

**قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (46)**

کہ حضرت صالح نے ناقۃ اللہ سے متعلق فرمایا تھا کہ اس کے لیے بھی ایک باری کا دن ہے اور تمہارے (جانوروں) کے لیے بھی ایک متعین دن کی باری ہے۔

اس آیت کے اشارۃ النص سے مجتہد نے استنباط کرتے ہوئے یہ استحسان کیا کہ چونکہ ایک چیز سے فائدہ اُٹھانے میں دونوں یا دو سے زائد شرکاء کا متفق ہونا مشکل ہے۔ اس لیے "مہایاۃ" میں ایک وقت میں فوائد کو اکٹھا کر دیا جاتا ہے اور ان سے باری باری شرکاء مستفید ہوتے ہیں، جیسے تقسیم کے عمل سے پھیلے ہوئے حصہ کو ایک خاص حصہ میں منحصر کر دیا جاتا ہے اور ہر فریق اپنے حصہ سے فائدہ اُٹھاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قاضی جیسے کسی چیز کو شرکاء میں

تقسیم کرنے کا فیصلہ بعض شرکاء کے اس پر رضامند نہ ہونے کے باوجود کرسکتا ہے، اسی طرح اگر بعض شرکاء ''مہایاۃ'' پر رضا مند نہ ہوں اور تقسیم کے خواہاں بھی نہ ہوں تو ایسی صورت میں بعض شرکاء کے مطالبہ پر قاضی ''مہایاۃ'' کا فیصلہ بھی کرسکتا ہے۔

## ۱۳۔ ذخیرہ اندوزی ناجائز ہے:

ہر ایسی چیز کا احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی کرنا درست نہیں، جس سے عوام الناس کو تکلیف پہنچے۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی ناجائز نہ ہو کیوں کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مملوکہ چیز جب چاہے فروخت کرے اور جب تک چاہے اپنے پاس رکھے۔ کوئی دوسرا شخص اس کی رضا مندی کے بغیر اس کی مملوکہ چیز کو حاصل نہیں کرسکتا۔

استحسان کی وجہ یہ حدیث نبوی ہے:

**الجالب مرزوق والمحتکر ملعون (47)**

جالب (یعنی جو اپنے شہر کے لیے اشیاء خرید کر لاتا ہے اور فروخت کرتا ہے تا کہ لوگوں کی ضروریات پوری ہوں) کو رزق دیا جاتا ہے اور محتکر (جو لوگوں کو تکلیف دینے کے لیے اشیاء روکے رکھتا ہے) قابل لعنت ہے۔

مجتہد کی نظر میں رسول اکرم ﷺ نے یہ استحسان اس بنیاد پر کیا کہ ضرورت کے وقت اس کی چیز کے ساتھ دوسرے لوگوں کا حق بھی متعلق ہوگیا ہے اور فروخت سے باز رہنے میں لوگوں کے حق کو کالعدم قرار دینا اور ان پر تنگی کرنا لازم آتا ہے، گویا آپ کا استحسان دفع ضرر (نقصان ختم کرنے) اور رفع حرج (تکلیف کو دور کرنے) کے اصول پر مبنی ہے۔

اس سلسلہ میں الہدایہ کی عبارت ملاحظہ ہو:

**لانہ تعلق بہ حق العامۃ وفی الامتناع عن البیع ابطال حقھم وتضییق الامر علیھم، فیکرہ اذا کان یضربھم (48)**

''اس لیے کہ اس کے ساتھ عوام کا حق بھی متعلق ہوگیا ہے، اور فروخت سے باز رہنے میں لوگوں کے حق کو کالعدم قرار دینا اور ان پر تنگی کرنا لازم آتا، سو مکروہ ہے جب کہ ان کے لیے نقصان دہ ہو''۔

## ۱۴۔ قسامہ کے ساتھ دیت بھی لازم ہوگی:

کسی شخص کی لاش، محلّہ میں پائی گئی اور قاتل نامعلوم ہے تو اس محلّہ کے پچاس افراد سے اس بات کی قسم لی جائے گی کہ نہ تو انہوں نے مقتول کو قتل کیا اور نہ انہیں اس کے قاتل کا علم ہے، اگر یہ لوگ اس چیز کی قسم اُٹھالیں تو ان پر دیت عائد کردی جائے گی۔

قیاس کا تقاضہ یہ ہے جیسا کہ امام شافعی کا مؤقف ہے کہ ان پر دیت لازم نہ ہو کیوں کہ شریعت میں قسم کھانے

کا مقصد مدعیٰ علیہ کا الزام سے بری ہونا ہے نہ کہ اس پر کسی چیز کا لازم ہو جانا۔

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ قسامہ کی مشروعیت اس بنا پر ہے کہ جو افراد جھوٹی قسم کھانے سے اجتناب کریں، ان کے ذریعہ قاتل تک رسائی حاصل ہو تا کہ قصاص لیا جاسکے، لیکن جب تمام افراد قسم کھالیں تو اس سے وہ قصاص اور قید سے بچ جائیں گے، لیکن انسانی جان بہر حال محترم ہے اور انسانی معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے افراد کا تحفظ کرے۔ کسی محلّہ میں لاش کی موجودگی، محلّہ میں قاتل کی موجودگی کی علامت نہ بھی ہو تو بھی بہر حال اس سے اہل محلّہ کی کوتاہی اور غفلت عیاں ہے، جس کا خمیازہ انہیں بھگتنا چاہئے اور دوسری طرف مرنے والے کی ورثاء کی مالی اعانت بھی ضروری ہے، یوں قسامہ اور دیت کی مشروعیت معاشرے کے باہمی تعاون اور دکھ سکھ میں شرکت کے بنیادی اسلامی اصول کی آئینہ دار ہے، جیسا کہ قتل خطا کی دیت اسی نقطہ نظر کے تحت عاقلہ پر لازم ہوتی ہے، اسی بنا پر رسول اکرم ﷺ اور بعد ازیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قسامۃ اور دیت کو اکٹھا کیا۔ (49)

یہ استحسان بالاثر ہے کہ مجتہد کی نظر میں رسول اکرم ﷺ نے مصلحہ کی حفاظت کے لیے استحسان کیا، اس سلسلہ میں علامہ مرغینانی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> **القسامة ماشرعت لتجب الدية اذا نكلوا، بل شرعت ليظهر القصاص بتحرزهم عن اليمين الكاذبة، فيقروا بالقتل، فاذا حلفوا حصلت البرأة عن القصاص، ثم الدية تجب بالقتل الموجود منهم ظاهر الوجود القتيل بين اظهرهم، لابنكولهم، او وجب بتقصيرهم في المحافظة كما في القتل الخطاء. (50)**
>
> ''قسامت کی مشروعیت اس لیے نہیں کہ لوگوں سے قسم سے انکار کی صورت میں دیت واجب ہو، بلکہ مشروعیت کی وجہ یہ ہے، جو افراد جھوٹی قسم کھانے سے احتراز کریں، ان کے ذریعہ قاتلوں تک رسائی ہو، کہ قتل کا اقرار کریں تا کہ قصاص لیا جاسکے، لیکن جب تمام افراد قسم کھالیں تو اس سے وہ قصاص سے بچ جائیں گے، پھر دیت اس قتل کی بناء پر لازم آرہی ہے جس میں لاش ان کے درمیان ظاہر طور پر موجود ہے، قسم کے انکار کی بناء پر لازم نہیں آرہی، یا اہل محلّہ کی حفاظت کی ذمہ داری میں کوتاہی سبب لازم ہوتی ہے، جیسا کہ قتل خطاء میں''۔

## ۱۵۔ اجیر مشترک اپنے پاس موجود سامان کا ذمہ دار ہے:

درزی اور رنگریز جیسے اجیر مشترک کو اس کے پاس موجود لوگوں کے سامان کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا، سوائے اس کے کوئی ایسی ناگہانی آفت آجائے، جس سے بچاؤ مشکل ہو، جیسے عمومی آتشزدگی، زلزلہ سے انہدام اور لوٹ مار وغیرہ۔

اس صورت میں قیاس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اجیر مشترک کے پاس اس کے ضائع ہونے والی چیز کا تاوان نہ ڈالا

جائے، سوائے اس کے کہ وہ کوتاہی یا زیادتی کا مرتکب ہو، کیوں کہ یہی عقد اجارہ کا تقاضہ ہے اور اس کے پاس چیزیں لوگوں کی اجازت سے اس کی تحویل میں ہیں، لہٰذا وہ امین ہے اور امین پر ضمان (تاوان) نہیں ہوتا۔

کیوں کہ شریعت کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ امین ودیع کے مثل ہے، یعنی اگر کوئی امانت بغیر تعدی و تقصیر کے ضائع ہوجائے تو اس سے اس کا تاوان نہیں لیا جائے گا، قیاساً ہر امانت پر یہی حکم منطبق کیا جاتا ہے جیسے شرکت کا مال کسی ایک شریک کے ہاتھ میں، اُجرت مستاجر کے پاس، عاریت کی چیز مستعیر کے ہاں اور مستاجر کا مال اجیر کے ہاں امانت ہے تو قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ اجیر مشترک سے بغیر تعدی و تقصیر کے کوئی چیز ضائع ہوجائے تو اس سے تاوان نہ لیا جائے، جیسے اجیر خاص یعنی ملازم خاص جس نے اپنا پورا وقت مستاجر کو سونپا ہے جیسے خادم اور ڈرائیور وغیرہ سے تاوان نہیں لیا جاتا۔

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ کاریگروں سے تاوان لینے پر خلفاء راشدین متفق ہیں، باوجودیکہ ان کی حیثیت امین ہی کی ہے، لیکن یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ اگر ان کو ضامن نہ بنایا جائے تو وہ لوگوں کے سامان اور ان کی چیزوں کی حفاظت میں غفلت برتیں گے اور لوگ ان سے کام لینے کی شدت سے احتیاج محسوس کرتے ہیں تو مصلحت اسی میں تھی کہ ان کو ان چیزوں کا ضامن قرار دیا جائے تاکہ وہ لوگوں سے لی ہوئی چیزوں کی حفاظت کریں۔ اسی بنا پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ **لایصلح الناس الا ذاک** (لوگوں کو یہی چیز درست رکھ سکتی ہے)۔ (51)

استحسان بالاثر کی مندرجہ بالا مثالوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ استحسان بالاثر کا دائرہ اجتہاد سے ماورا نہیں ہے، اور فقہاء احناف نے اس کو بجا طور پر اجتہادی ماخذ میں شمار کیا ہے۔

www.rahmia.org

# حوالہ جات


1. فیروز آبادی، محمد بن یعقوب محمد الدین (۸۱۷ ھ)، القاموس المحیط، مطبعہ مصطفی البابی الحلبی، القاھرہ(۱۳۷۱ ھ)، مادہ "حسن".
2. السرخسی، محمد بن احمد بن ابی السھل، شمس الائمہ (۵۰۰ ھ) تمہید الفصول فی الاصول (تحقیق ابو الوفاء الافغانی) مطابع دار الکتاب العربی، قاھرہ (۱۳۷۳ ھ)، ج2، ص220.
3. القرآن، سورۃ الزمر، آیات18,17.
4. الآمدی، علی بن علی، ابوالحسن، سیف الدین (۶۳۱ ھ) الاحکام فی اصول الاحکام، مطبعہ المعارف، مصر(۱۳۳۲ ھ)، ج4، ص136.
5. القرآن، سورۃ الزمر، آیت55.
6. العسقلانی، احمد بن علی بن محمد بن حجر (۸۵۲ھ) الدرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ عن احمد، مطبوع علی ھامش الھدایہ، ج3، ص303.
7. الآمدی، الاحکام فی اصول الاحکام، ج4، ص157,156.
8. السبکی، علی بن عبدالکافی (۷۵۶ ھ) وابنہ عبدالوھاب بن علی تاج الدین (۷۷۱ھ)، الابھاج فی شرح المنھاج، دارالکتب العلمیہ، بیروت (۱۴۰۴ ھ)، ج3، ص91.
9. الجصاص، احمد بن علی، الرازی، ابوبکر (۳۷۰ ھ)، اصول الفقہ، ج2، باب القول فی الاستحسان، مخطوطہ دار الکتب المصریہ (نسخہ مصورۃ، خالد ایم اسحاق مرحوم لائبریری، کراچی).
10. Kamali, Muhammad Hashim, Principles of Islamic Jurisprudence Pelanduk Publications (M) Sdn Bhd Petaling, Jaya Selangor, Darul Ihsan Malysia, P.327.
11. حسن الخضاوی، الاستحسان تعریفہ وحجیتہ، بحوث المؤتمر للفقہ المالکی (۱۹۸۶ ھ) رئاسۃ القضاء الشرعی، ابوظبی، ص653.
12. السرخسی، تمھید الفصول فی الاصول، ج2، ص200.
13. الزحیلی، وھبہ، ڈاکٹر (المعاصر) اصولِ فقہ الاسلامی، دارالفکر، دمشق (۱۴۰۶ ھ)، ج2، ص781,780.
14. ابن ماجہ، محمد بن یزید القزوینی (۲۷۵ ھ)، السنن، ابواب الاحکام، باب من بنی فی حقہ


www.rahimia.org

مایضر بجارہ، حدیث نمبر 234.
15. السیوطی، عبدالرحمن بن ابی بکر، جلال الدین (۹۱۱ ھ)، الاشباہ و النظائر فی الفروع، مطبعہ مصطفی محمد، مصر (ت.ن)، ص116.
16. .......... ایضاً ..........
17. الجصاص، اصول الفقہ، ج2، باب القول فی الاستحسان.
18. البخاری، عبدالعزیز، علاء الدین (۷۳۰ ھ) کشف الاسرار علی اصول البزدوی، شرکۃ صحافیہ عثمانیہ، استنبول (۱۳۰۸ ھ)، ج4، ص5.
19. مصطفی احمد الزرقا، المدخل الفقھی العام، مطبعہ طربین، دمشق (۱۳۸۷ھ)، ص93.
20. ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، السجستانی (۲۷۵ ھ)، السنن، کتاب الطھارۃ، باب الاذی یصیب النعل، حدیث نمبر 386.
21. المرغینانی، علی بن ابی بکر، ابوالحسن، برھان الدین (۵۹۳ ھ)، الھدایہ، مکتبہ شرکۃ علمیہ، ملتان، (ت.ن) بالانجاس و تطھیرھا، ج1، ص72.
22. .......... ایضاً ..........
23. المرغینانی، الھدایہ، باب الحدث فی الصلاۃ، ص128.
24. ابن ماجہ، السنن، ابواب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا، باب ماجاء فی البناء علی الصلاۃ، حدیث نمبر 1220.
25. .......... ایضاً ..........، ابواب الزکاۃ، باب زکاۃ العسل، حدیث نمبر 1824.
26. المرغینانی، الھدایہ، باب زکاۃ الزروع والثمار، ج، ص202.
27. البخاری، کشف الاسرار، ج4، ص5.
28. مسلم بن الحجاج القشیری، (۲۶۱ ھ)، الجامع الصحیح، کتاب الصیام، باب اکل الناس وشربہ و جماعہ لایفطر، حدیث نمبر 2716.
29. المرغینانی، الھدایہ، باب مایوجب القضاء والکفارہ، ج1، ص217.
30. القرآن سورۃ النساء، آیت 24.
31. مسلم، الجامع الصحیح، کتاب النکاح، باب تحریم الجمع بین المرأۃ و عمتھا او خالتھا فی النکاح، حدیث نمبر 3436.
32. المرغینانی، الھدایہ، کتاب النکاح، ج2، ص309.
33. مصطفی دیب البغا، اثر الادلۃ المختلف فیھا (مصادر التشریع التبعیہ) فی الفقہ الاسلامی، دار

www.rahimia.org

الامام البخاری، دمشق (١٣٨٨ھ)، ص150.
34. المرغینانی، الهدایه، باب طلاق المریض، ج2، ص392.
35. .......... ایضاً .........، ص390.
36. البخاری، محمد بن اسماعیل، ابوعبدالله (٢٥٦ھ) الجامع الصحیح، کتاب المحاربین من اهل الکفر والردة، باب الرجم بالمصلی، حدیث نمبر6820 .
37. المرغینانی، الهدایه، کتاب الحدود، ج2، ص508.
38. العسقلانی، الدرایه فی تخریج احادیث الهدایه، ج2، ص548.
39. المرغینانی، الهدایه، کتاب السرقه، ج2، ص547.
40. ابوداؤد، السنن، کتاب الزکوٰة، باب فی زکوٰة السائمة، حدیث نمبر1575.
41. ابن القیم الجوزیه، محمد بن ابی بکر، ابوعبدالله (٧٥١ھ)، اعلام الموقعین عن رب العالمین (تحقیق عبدالرحمن الوکیل) شرکة الطباعة الفنیة المتحدة، القاهره (١٣٨٨ھ)، ج2، ص86.
42. العسقلانی، الدرایة فی تخریج احادیث الهدایة، ج2، ص564.
43. القرآن، البقره، آیت126.
44. العسقلانی، الدرایة فی تخریج احادیث الهدایة عن احمد، ج3، ص57.
45. المرغینانی، الهدایه، باب البیع الفاسد، ج3، ص58,57.
46. القرآن، سورة الشعراء، آیت155.
47. ابن ماجه، السنن، ابواب التجارات، باب الحکرة والجلب، حدیث نمبر2153.
48. المرغینانی، الهدایه، کتاب الکراهیة، ج4، ص470.
49. البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الدرایات، باب القسامة، حدیث نمبر6898.99.
50. المرغینانی، الهدایه، باب القسامة، ج4، ص636.
51. الشاطبی، ابراهیم بن موسیٰ، ابواسحاق (٧٩٠ھ)، الاعتصام، المکتبة التجاریة الکبریٰ، مصر (ت.ن)، ج2، ص141.

www.rahimia.org

تعارف شخصیات

# حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اجدادِ گرامی اور اخلافِ کرام

## (خانوادۂ ولی اللہی کے بارے میں تاریخی و تحقیقی معلومات)

تحریر: مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

(حضرت الامام دہلویؒ کے صحیح نسب نامہ کی جستجو، اس خاندان کا ہندوستان میں ورود و نزول، آپ کے جد گرامی حضرت شیخ شمس الدین مفتی کا عہد، ان کا مدفن، اس خاندان کی رہتک میں بود و باش، حضرت شاہ ولی اللہ کے نکاحوں اور اولاد کی تفصیلات، اور ان کے صحیح سنین ولادت و وفات کی تعیین)

(1)

## شاہ صاحبؒ کا نسب نامہ

حضرت شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیفات میں اپنے فاروقی النسل ہونے کی صراحت فرمائی ہے۔(1) اور ''الامداد فی مأثر الاجداد'' (2) میں اپنے والد ماجد سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک اپنا مفصل شجرہ نسب بھی درج کیا ہے، جس میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک درج ذیل کل بتیس (32) واسطے بیان فرمائے ہیں:

''فقیر ولی اللہ۔ بن شیخ عبدالرحیم۔ بن الشہید وجیہ الدین۔ بن معظم۔ بن منصور۔ بن احمد۔ بن محمود۔ بن قوام الدین عرف قاضی قاذن۔ بن قاضی قاسم۔ بن قاضی کبیر عرف قاضی بدھ۔ بن عبدالملک۔ بن قطب الدین۔ بن کمال الدین۔ بن شمس الدین مفتی۔ بن شیر ملک۔ بن عطا ملک۔ بن ابوالفتح ملک۔ بن عمر حاکم ملک۔ بن عادل ملک۔ بن فاروق۔ بن جرجیس۔ بن احمد۔ بن محمد شہریار۔ بن عثمان۔ بن ماہان۔ بن ہمایوں۔ بن قریش۔ بن سلیمان۔ بن عفان۔ بن عبداللہ۔ بن محمد۔ بن عبداللہ۔ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ''۔(3)

الامداد کے مطبوعہ ایک نسخہ میں عفان کے بعد دو واسطے محمد بن عبداللہ درج نہیں (4) مگر یہ سہو کتابت ہے، صحیح اور معروف روایت وہی ہے جو اوپر گزری، الامداد کے ایک قلمی نسخہ (5) اور ایسے تمام ماخذ میں جو الامداد کی طباعت سے پہلے شائع ہوئے اور ان کی اساس الامداد کے خطی نسخوں پر ہے (6) محمد بن عبداللہ کا واسطہ درج ہے۔

www.rahimia.org

## فروگذاشتیں اور صحیح نسب نامہ کی جستجو

نسب نامہ ولی اللہی میں محمد بن عبداللہ کے اضافہ کے باوجود اس نسب نامہ کے آخری وسائط کی ترتیب محل نظر (7) ہے، کیوں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارہ (12) صاحبزادگان میں سے کسی کا نام عفان یا محمد نہیں یا ان بارہ صاحبزادوں کے اخلاف میں محمد نامی کوئی فرد صاحبِ اولاد نہیں، کئی نسلوں کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر کے ایک پوتے کا نام محمد ہے اور ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

''محمد بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما''۔(8)

محمد بن عبدالعزیز کے تین بیٹے ہوئے: ابراہیم، عبداللہ اور عیسیٰ۔

اگرچہ کوئی تحریری شہادت میسر نہیں مگر وجدان چاہتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کا شجرۂ نسب اخلاف حضرت ابن عمر کی اسی شاخ سے وابستہ و ملحق ہو، ممکن ہے سہو کتابت یا مرورِ ایام سے اس میں عفان بن عبداللہ بن محمد اور حضرت ابن عمر کے درمیان عبدالعزیز کا واسطہ ترک ہوگیا ہو۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو حضرت شاہ صاحب کے نسب نامہ کے آخری وسائط اس طرح ہونے چاہئیں:

''عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر بن الخطابؓ''۔

یعنی عفان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک چھے واسطے، جس میں تین شخصوں کا نام عبداللہ ہے۔ اس موقع پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ مذکورہ بالا سہو و ترکِ نسب نامہ میں عفان بن عبداللہ کے زیریں سلسلہ میں بھی بعض وسائط کے فقدان اور انقطاع کا اندیشہ ہے، جو عرب خاندانوں میں باہم مشابہ ناموں کے تکرار و تسلسل اور نسب نامہ کی نقل در نقل کی وجہ سے محل تعجب ہے نہ نسب نامہ کے مشکوک اور غیر معتبر ہونے کی دلیل۔

## نسب نامہ ولی اللہی کے تحت سلسلے میں انقطاع کا ایک قرینہ

"**الامداد فی ماثر الاجداد**" میں منقول نسب نامہ میں حضرت ابن عمر تک جملہ وسائط کی تعداد علم الانساب کی رو سے گیارہ صدیوں میں مطلوب وسائط کی تعداد سے خاصی کم ہے۔ مذکورہ نسب نامہ میں حضرت ابن عمر تک صرف تین واسطے درج ہیں، اگر اس میں محمد عبداللہ بن عمرؓ کے درمیان عبدالعزیز بن عبداللہ کا نام درج ہو تو کل بتیس واسطے ہو جائیں گے، حالانکہ علم الانساب کے معروف اصول کے مطابق ایک صدی میں کم سے کم تین نسلیں ضروری ہیں۔ اگرچہ بعض خاص حالات اور ناقبل تردید دلائل کی موجودگی میں دو صدیوں میں پانچ واسطے بھی قابل قبول ہیں۔ اس اصول کی رو سے نسب نامہ ولی اللہی کی صداقت کے لیے حضرت شاہ صاحب سے حضرت ابن عمر تک کم سے کم تینتیس (33) واسطے ضروری ہیں، اور چونکہ بعض اوقات ایک صدی میں چار پانچ نسلیں بھی گزر جاتی ہیں، اس لیے نسب نامہ ولی اللہی کے معلوم وسائط کی تعداد میں کچھ اور اضافہ ناگزیر ہے، گویا شاہ صاحب سے حضرت ابن عمر تک

www.rahimia.org

پینتیس چھتیس واسطے مطلوب ہیں، نسب نامہ ولی اللہی کی موجودہ ترتیب کی تحقیق و تصدیق یا نامعلوم وسائط کی دریافت و توثیق ہونے تک نسب نامہ کی موجودہ روایت کے متعلق شک و شبہ اور بحث و گفتگو کی خاصی گنجائش ہے، نسب نامہ میں کہاں کس قدر وسائط ترک ہوئے، نسب نامہ کی مکمل اور صحیح ترتیب کیا ہے، کچھ معلوم نہیں۔

## اس نسب نامہ کی حیثیت خود شاہ ولی اللہ کی نظر میں

نسب نامہ ولی اللہی کے مطالعہ اور تحقیق کے وقت یہ فراموش نہیں ہونا چاہیے کہ الامداد فی ماثر الاجداد میں درج شجرہ نسب حضرت شاہ عبدالرحیم (9) اور شاہ ولی اللہؒ کو اپنے بزرگوں سے اسی طرح ملا تھا، جس کو شاہ صاحب نے جوں کا توں نقل کر دیا ہے، ضروری نہیں کہ یہ دونوں حضرات نسب نامہ کی اس روایت کو من و عن صحیح اور بہمہ جہت لائق استناد سمجھتے ہوں، شاہ ولی اللہ کی ایک عبارت سے جھلکتا ہے کہ شاہ صاحب کو نسب نامہ کی موجودہ روایت و ترتیب پر بہت اعتماد نہیں تھا۔ حضرت شاہ صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''در نسب نامہائے قدیم کہ در رہتک و در قبیلہ شاہ ارزانی بدایوانی کہ نسب وے بسالارِ حسام الدین ابن شیر ملک میر سد موجودند چنیں یافتہ شد ........ و ''ملک'' در زمان قدیم لفظ تعظیم بودہ است مثل ''خان'' در زمان ما، واللہ اعلم بحقیقت الحال''۔(10)

یعنی حضرت شاہ صاحبان اس نسب نامہ کے صرف ناقل و راوی ہیں، اس کی سہو و انقطاع اور فروگزاشتوں کے لیے ذمہ دار نہیں۔

## (2)

## حضرت شاہ ولی اللہ کے اجداد کے ایران و افغانستان سے روابط

اگرچہ اس خاندان کے عرب علاقے سے ترکِ وطن کے عہد اور ایران و افغانستان میں ان کے زمانہ قیام اور محل اقامت کے متعلق کچھ کہنا آسان نہیں، مگر بعض آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عفان بن محمد یا ان کے اخلاف دوسری صدی کے اواخر یا تیسری صدی ہجری کے شروع میں اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ایران آئے اور وہیں سے بعد میں افغانستان منتقل ہوئے، ایران میں آذربائیجان اور ماوراء النہر کے علاقے اور افغانستان میں کابل اور اس کے اطراف ان کی جائے قیام تھی، بعض غیر مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان ماوراء النہر اور نواحِ کابل میں حکمراں اور صاحب اقتدار بھی رہا ہے۔ جناب عبدالشاہد خان شروانی کی اطلاع ہے کہ:

> ''علامہ (فضل حق خیرآبادی اور حضرت شاہ ولی اللہؒ) کے مورث اعلیٰ شیر الملک بن شاہ عطاء الملک ایرانی (کذا؟) کے مورثان ایک قطعہ ملک ایران پر قابض و حکمران تھے''۔(11)

www.rahimia.org

مولانا سید محبوب علی جعفری (12) کا بھی یہی خیال ہے، وہ لکھتے ہیں:

**لکن الثابت عندی علی الظن القوی "ان اولاد قریش بن سلیمان بن عفان بن عبدالله العمری المتوطن بما وراء النهر کانوا من ملوک اطرافها و کان ذالک الملک فیهم الی ان مات ابواسحاق والی البخاریٰ و تملک الاتراک القابضون بالنیابة قبل (کذا) و ذالک سنة سبع و ستین و ثلثمائة". (13)**

اگر یہ اطلاعات درست ہیں تو اس خاندان کے حکومت واقتدار کا نفاذ حدودِ افغانستان میں ہونا چاہیے کیوں کہ افغانستان میں تیسری چوتھی صدی ہجری میں فاروقی خانوادوں کے عمل دخل اور سیاسی اثر ونفوذ کے قرائن دستیاب ہیں۔(14) لیکن مولانا محبوب علی جعفری کی اس رائے سے اتفاق مشکل ہے کہ شیر ملک کے جد ماہان بن ہمایوں اور امیر بلخ موسیٰ بن ہامان ہم جد، اور ایک خاندان کے رکن ہیں، مولانا جعفری نے لکھا ہے:

**و نقلنا ایضاً اسم رجل من امراء بلخ من اقران ابراهیم و شقیق وهو علی بن موسیٰ بن هامان امیر البلخ، فیحتمل ان یکون ماهان بن همایون بن قریش مع الاحتمال یکون ماهان تصحیف هامان". (15)**

نسب نامہ خاندان ولی اللہی میں ماہان بلاشبہ ایک اہم اور توجہ طلب نام ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ شاہ صاحب کے جد عثمان کے والد اور امیر بلخ کے دادا کا نام ایک جیسا ہے، مگر ہم عصر افراد میں ناموں کی اس قدر یکسانیت و ہم رنگی عام ہے، اور اس طرح کی یکسانیت کبھی بھی ان کے ہم جد اور ہم خاندان ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، علاوہ ازیں مولانا جعفری کو امیر بلخ کے صحیح نام میں سہو ہوا، صحیح نام علی بن حسین بن ماہان ہے۔(16) نیز اس تاویل وتوجیہ کی اس لیے بھی ضرورت نہیں کہ امیر بلخ ماہان فاروقی ہیں نہ عرب، بلکہ فارسی الاصل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ماہان آذربائیجان اور ماوراء النہر میں ایک خاصا معروف اور چلا ہوا نام تھا، کتب رجال وطبقات میں اس نام ونسبت کے متعدد افراد کا تذکرہ محفوظ ہے۔(17) اور ماہان نامی ایک شخص ایک بڑے خاندان کے مورثِ اعلیٰ بھی تھے، ان کی وجہ سے ان کی تمام اولاد ابن ماہان کہلاتی ہے۔(18)

## نسب نامہ ولی اللہی میں 'ملک' خطاب یافتہ افراد کے عہد کی تعیین

شاہ صاحب کی اطلاع کے بموجب ان کے خاندان کے پانچ بزرگوں شیر ملک، بن عطاء ملک، بن ابوالفتح ملک، بن عمر حاکم ملک، بن عادل ملک کے نام کے ساتھ ''ملک'' کا لاحقہ ثبت ہے، جو اس خاندان کے شاندار اور پُروقار ماضی اور سرکاری دربار میں عزت ومقبولیت کا مظہر ہے، شاہ صاحب کا ارشاد ہے:

''و''ملک'' درزمان قدیم لفظ تعظیم بودہ است مثل ''خان'' درزمانِ ما''۔(19)

تاریخ حضرت شاہ صاحب کے اس قول کی تو تصدیق کرتی ہے (20) مگر وہ اس سلسلہ میں ہماری مدد اور رہنمائی نہیں کرتی کہ اس خاندان کے افراد کے لیے ملک کا استعمال اس حکومت کی یادگار اور باقیات کے طور پر ہوتا تھا، جس کی طرف مولانا جعفری اور شروانی نے اشارہ کیا ہے یا یہ لاحقہ ایران و افغانستان کے بادشاہوں سے قربت و اختصاص کا ثمر ہے؟۔

اگرچہ "ملک" کا خطاب و مرتبہ شاہانِ تغلق کے زمانے تک ہندوستان میں بھی ایک لائق فخر اور باوقعت منصب رہا، لیکن خاندانِ ولی اللہی کے نسب نامہ میں مذکور جن اشخاص کے ساتھ اس کا استعمال ہوا ہے، ان کا زمانہ قطب الدین ایبک سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے خیال آتا ہے کہ یہ لاحقہ اس خاندان کے زمانہ قیامِ افغانستان کی یادگار ہے اور ہندوستان کی حکومتوں اور اہل دربار و مناصب سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس خیال کی اس سے تائید ہوتی ہے کہ اس عہد کے نامور مؤرخین منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، شمس سراج عفیف اور یحییٰ بن احمد سرہندی نے اپنی کتابوں میں ملک خطاب یافتہ بے شمار افراد کا مختلف موقعوں پر ذکر کیا ہے اور اس میں شیر ملک، عطاء ملک اور ابوالفتح ملک نامی افراد بھی شامل ہیں، مگر اس طویل فہرست میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کو خانوادہ شیر ملک سے وابستہ و منسلک قرار دیا جاسکے، اگر شیر ملک اور ان کے اجداد دربار دہلی سے وابستہ رہے ہوتے تو ان کا مذکورہ بالا مآخذ میں تذکرہ ہونا چاہئے تھا۔

## (3)

## خاندانِ ولی اللہی کے بزرگوں کا ہندوستان میں وُرود اور اس کا زمانہ

خاندانِ ولی اللہی کے اجداد میں کون بزرگ کس زمانہ میں ہندوستان آئے، اس کے متعلق کوئی واضح اطلاع دستیاب نہیں، حضرت شاہ صاحب کی تحریر سے بھی صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کے جد امجد شیخ شمس الدین مفتی، رہتک مین خاندانِ قریش کے پہلے فرد تھے۔ (21) مگر رہتک آنے سے پہلے شیخ شمس الدین یا ان کے آباء و اجداد ہندوستان کے کسی اور علاقہ میں مقیم تھے یا براہِ راست اسی وقت افغانستان سے رہتک آئے تھے، کچھ معلوم نہیں۔ اگر اس خاندان کے ہندوستان آنے والے اولین بزرگ شیر ملک کے فرزندان سالار حسام الدین اور شمس الدین مفتی ہوں تو ان کا عہد محمد غوری اور ایبک کا زمانہ ہونا چاہئے، یہ دونوں شخص ہندوستان ساتھ آئے ہوں گے، یہاں پہنچ کر سالار حسام الدین نے بدایوان میں اقامت اختیار کی اور شمس الدین مفتی نے رہتک میں رخت سفر کھولا۔ حسام الدین حرب و ضرب کے ماہر اور سیف و سنان کے ادا شناس ہوں گے، اس لیے سالار کے لقب سے نوازے گئے اور شیخ شمس الدین نے علم و فضل میں کمال حاصل کیا اور مفتی کے لقب سے معزز گردانے گئے۔

بدایوں میں محلّہ سوتھ کی ایک پرانی مسجد جو بدایوں میں اسلامی عہد کے ابتدائی دور کی یادگار ہے، کے سب سے

www.rahimia.org

پہلے بانی حسام الدین نامی کوئی بزرگ تھے، مؤلف کنزالتاریخ نے لکھا ہے:

''اس مسجد میں ایک کتبہ لگا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد بھی ایک معبد قدیم، شروع آمد اہل اسلام کی ہے اور مشہور ہے کہ حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی نے اس مسجد میں بیٹھ کر زمانہ طالب علمی میں مطالعہ فرمایا ہے۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اول بانی مسجد حسام الدین تھے، بعد ازاں حضرت نظام الدین اولیاء نے تعمیر کرائی۔ اس کے بعد مرتبہ سوم ۱۱۲۰ھ میں محمد منیر نے تعمیر کی۔ کتبہ (22) یہ ہے:

بود از قدیم بانی مسجد حسام دین
چوں کہنہ گشت ریختہ افتاد بر زمین
زاں پس نظام دین بنا کرد از جدید
تا مدتے مدید فروماند ہم چنیں
بعد از وفاتِ او چو محمد منیر ساخت
بیت العتیق خانہ اسلام شد ببیں
تاریخ سال او ز خرد خواستم بگفت
آرند صوفیان سر سجدہ بر زمین''۔

اگر اس مسجد کے بانی سالار حسام الدین بن شیر ملک تھے، جو عین ممکن اور قرین قیاس ہے۔ (23) تو اس سے شیر ملک کے بیٹوں کے ہندوستان آنے کا عہد تقریباً متعین ہو جاتا ہے۔ اوپر گزر گیا ہے کہ یہ مسجد بدایوں میں مسلمانوں کے بالکل ابتدائی دور کی یادگار ہے، بدایوں قطب الدین ایبک نے ۵۹۹ھ میں فتح کیا۔ (24) لیکن مسلمانوں کی ایک قابل ذکر آبادی اور ان کی مذہبی عمارتیں وہاں اس سے پہلے موجود تھیں، (25) اگر یہ مسجد اسی ابتدائی زمانہ کی یادگار ہے تو ممکن ہے اس کی تاسیس چھٹی صدی ہجری کے نصف آخر میں کسی وقت ہوئی ہو، اور اگر یہ مسجد ایبک کی فتوحات کے بعد تعمیر ہوئی تو اس کا زمانہ تعمیر ساتویں صدی ہجری کے ابتدائی سال ہیں، دونوں صورتوں میں اس کے بانی حسام الدین (اگر وہ شیر ملک کے بیٹے ہیں) اور ان کے بھائی شیخ شمس الدین مفتی کا عہد متعین ہو جاتا ہے۔ ایک اور قرینہ سے بھی تقریباً اسی عہد کی تعیین ہوتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے:

''واول کسے کہ از نژاد قریش دراں بلدہ در آمد و بسبب وے شعائر اسلام ظہور نمودہ وطغیان کفر منطفی شدہ، وے (شمس الدین مفتی) بود''۔ (26) (اور سب سے پہلے بنوقریش میں سے جو شخص اس شہر (رہتک) میں آئے اور ان کی کوشش سے وہاں شعائر اسلام ظاہر ہوئے اور کفر کی ظلمت کافور ہوئی، وہ شیخ شمس الدین مفتی تھے۔)

افسوس کہ اس عہد کی تاریخیں، خصوصاً تاریخ رہتک شیخ شمس الدین مفتی کے تذکرہ سے بالکل خاموش ہے، لیکن

www.rahmia.org

اگر حضرت شاہ صاحب کی یہ اطلاع درست ہے تو شیخ شمس الدین، مفتی شیخ قوام الدین جنجیری (جو صدیقیان مُہم و رہتک کے جد امجد ہیں) سے پہلے رہتک تشریف لائے، اور قاضی قوام الدین ساتویں صدی میں رہتک نزول فرما ہوئے تھے، (27) گویا جب قاضی قوام الدین رہتک آئے تو اس وقت شیخ شمس الدین مفتی کی کوششوں سے رہتک گہوارۂ اسلام بن چکا تھا، اور وہاں خود شمس الدین یا ان کے اخلاف اقامت پذیر تھے۔ شیخ شمس الدین کے تذکرہ میں حضرت شاہ صاحب کے درج ذیل الفاظ:

''بعد انقضائے ایامِ حیوۃ ایں بزرگ گزیں ترین اولادش کمال الدین مفتی برطریقۂ وے مصدر ایں امور گشت، و بعد از وے پسر وے قطب الدین، و بعد از وے پسر وے عبدالملک ہمیں وضع ایام حیوۃ بآخر رسانیدند، و بعد از زمان ایں عزیزاں نصب قضات دریں بلاد دستور شد''۔(28)

بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہیں کہ شیخ شمس الدین کا عہد چھٹی صدی ہجری کا ہے، اس وقت تک اس نواح میں اسلامی حکومت کی عملداری پوری طرح قائم و مستحکم نہیں ہوئی تھی، کچھ وقت گزرنے کے بعد جب اسلامی نظم حکومت استوار ہوا تو شیخ شمس الدین مفتی کے اعقاب و اخلاف اپنے جد و پدر کی علمی دینی مناصب و خدمات کے صحیح وارث و امین قرار پائے اور معاصر حکمرانوں کی جانب سے منصب قضاء کے لیے نامزد و متعین کئے گئے، اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ ان کے خاندان میں رہتک کی دینی امارت و قیادت اور عہدہ قضا کا تسلسل کئی نسلوں تک قائم رہا۔

## شیخ شمس الدین مفتی کا مدفن

اگرچہ شیخ شمس الدین مفتی کے تفصیلی حالات اور ان کا سنہ وفات معلوم نہیں، لیکن الامداد میں حضرت شاہ صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مفتی کا جنازہ ان کے خلوت کدے سے غائب ہوگیا تھا، جہاں وہ نمازِ جنازہ کے بعد ان کی حسب وصیت رکھ دیا گیا تھا، واقعہ کی صحیح حقیقی صورت کیا تھی اور جنازہ کس طرح غائب ہوا، اس کی تحقیق و تصدیق کا کوئی ذریعہ ہمدست نہیں، مگر ایک قدیم یادداشت (29) سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ شمس الدین مفتی، پرانی دلی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے قریب جنگل میں دفن ہوئے اور ان کی قبر ''مزار جنازہ پراں'' کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ مولانا جعفری بھی اس اطلاع کی تصدیق کرتے ہیں، ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ مفتی کی وفات کسی اور مقام پر ہوئی تھی، جنازہ ''مہرولی'' میں ملا اور وہیں دفن کیا گیا۔ مولانا لکھتے ہیں:

**ویذکر فی اهل مرهولی (کذا) جوار مزار خواجه قطب الدین ان جنازه اتت قریب المصلی فی الدفن القدیم فدفنوه، فقیل لصاحب ذالک القبر پیر جنازه پران قدس سره، فقبره یزار و یتبرک به". (30)**

www.rahimia.org

یہ مزارات آج تک موجود اور زیارت گاہِ خلائق ہیں، اگرچہ سرسید احمد نے ان کا ذکر نہیں کیا، لیکن دلی کی تاریخی آثار و عمارات کے ایک اور محقق و مؤرخ مولوی بشیر الدین احمد نے ان کا جائے وقوع مہرولی میں عیدگاہ التمش کے عقب میں دیوارِ عیدگاہ سے ملحق بتایا ہے، اور لکھا ہے:

''عیدگاہ کی پچھیت کی دیوار سے ملے ہوئے چند مزار ہیں، جن میں سے دو کے نام لوگ بتاتے ہیں جنازہ پراں، اور شیخ جلال الدین تبریزی اور تین قبریں بے نام ہیں''۔(31)

مولوی بشیر الدین نے دو مزارات کا ذکر کیا ہے، مگر دراصل یہ پانچ الگ الگ قبریں ہیں، مگر ان میں سے کسی پر بھی کتبہ نصب نہیں، تاہم یہ معلوم و معروف ہے کہ ان میں ایک قبر شیخ جلال الدین تبریزی کی اور ایک شیخ شمس الدین جنازہ پراں کی ہے، (32) یہ قبریں عیدگاہ التمش کی غربی دیوار سے بالکل ملحق اور مزارِ شیخ اوحد الدین کرمانی سے کسی قدر فاصلے پر ہیں۔(33)

## شیخ شمس الدین کے اعقاب واخلاف کی رہائش گاہ

دسویں صدی ہجری کے اواخر تک یہ تمام خاندان قلعہ رہتک کے متصل اس عمارت میں رہائش پذیر تھا، جو قلعہ خورد کہی جاتی تھی اور بعد میں محلّہ چشتیاں کے نام سے مشہور ہوئی، (34) دسویں صدی کے اواخر میں شیخ احمد بن محمود نے شیخ عبدالغنی سونی پتی (م ۱۰۱۶ھ) (35) کی دختر سے شادی کی اور سونی پت سے رہتک واپسی کے بعد اپنے اور اپنے اہل خاندان کے رہنے کے لیے قلعہ نما ایک وسیع عمارت تعمیر کرائی، حضرت شاہ ولی اللہؒ تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ احمد در صغر سن از رہتک برآمد و با شیخ عبدالغنی ابن شیخ عبدالحکیم نشو و نما یافت، مشار الیہ اُو را باجگر پارۂ خود ازدواج دادہ، مدتے ترتیب فرمودہ، بعد ازاں در رہتک باز آمدہ بیرون قلعہ عمارتے ساختہ، اعوان وموالی خود را با خود جاداد''۔(36)

یہ عمارت اولاً قلعہ شیخ احمد کے نام سے، پھر سرائے شیخ احمد اور آخر میں محلّہ سرائے کے نام سے مشہور ہوئی، 1947ء تک خانوادہ شیخ احمد اور شیخ ابوالرضا محمد کے بچے کھچے افراد اسی محلّہ میں رہتے تھے، قیامِ پاکستان کے بعد وہ سب پاکستان جا کر اِدھر اُدھر مختلف شہروں میں منتشر ہوگئے، اور حویلی کے آثار نیست و نابود ہوکر اغیار کے مکانات بن گئے۔ سدا نام رہے اللہ کا۔

شیخ احمد نے ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی، (37) ان کے پرپوتے شاہ وجیہ الدین سیواجی مرہٹہ کے عہد میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے اور بھوپال کے قریب دفن ہوئے، اس نواح میں شاہ وجیہ الدین کنگن ولی کے نام سے مشہور ہیں، (38) اگرچہ الامداد میں شاہ وجیہ الدین کے سنہ وفات کا ذکر نہیں، مگر یہ امر یقینی ہے کہ وہ ربیع الاول ۱۰۹۱ھ/ اپریل 1680ء میں سیواجی مرہٹہ کی موت سے پہلے رحلت کر گئے تھے۔

# (4)

## حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زوجات محترمات

شاہ ولی اللہؒ کے دو نکاح ہوئے، پہلا مسماۃ امۃ الرحیم بنت شاہ عبیداللہ پھلتی سے ۱۱۲۸ھ/ 1716ء میں اس وقت ہوا جب شاہ عبدالرحیم حیات تھے اور شاہ ولی اللہ کی عمر صرف چودہ سال تھی، خود شاہ صاحبؒ کا ارشاد ہے: ''و سال چہاردہم صورت تزوج گرفت''۔(39) مگر شاہ صاحب نے اس کی صراحت نہیں کی کہ اس وقت صرف نکاح ہوا تھا یا شادی کے تمام مراسم سرانجام ہوگئے تھے، لیکن قرین قیاس ہے کہ اسی وقت رخصتی بھی ہوگئی ہوگی۔

امۃ الرحیم شاہ ولی اللہ کے ماموں، شاہ عبیداللہ کی دختر اور شاہ محمد عاشق پھلتی کی ہمشیر تھیں، انہوں نے شادی کے بعد اکیس سال حضرت شاہ ولی اللہ کی معیت و رفاقت میں بسر کئے اور تقریباً ۱۱۴۹ھ/ 1736ء میں تین بچے، ایک بیٹا، دو بیٹیاں چھوڑ کر وفات پاگئیں، ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے میر معین الدین ٹھٹھوی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''از عجائب اتفاقات آنکہ قبل ورود نامہ گرامی بچند روز اہلیہ ایں فقیر کہ بنت ... وہم بمعیت بست و یک سالہ می شد بمرض اسہال ازیں جہانِ واژگون انتقال کرد''۔(40)

مسماۃ امۃ الرحیم (41) کی وفات کے بعد شاہ صاحب نے سونی پت کے خانوادہ سادات (42) میں جس کے شاہ صاحب اور ان کے تمام اہل خاندان سے کئی نسلوں سے مراسم اور قرابت و ازدواج کے تعلقات تھے، (43) مولوی حامد سونی پتی (44الف) کی دختر بی بی ارادت سے دوسرا نکاح کیا، (44ب) ان دونوں خاندانوں کے باہمی قدیم رشتوں کے علاوہ مولوی حامد کی دختر سے نکاح کا ایک اور محرک یہ تعلق رہا ہوگا کہ مولوی حامد، شاہ عبدالرحیم کے رفیق درس (45) اور شاہ فخر العالم خلف شاہ ابوالرضا محمد کے داماد اور خلیفہ مجاز تھے۔(46)

اگرچہ بی بی ارادت سے نکاح کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، لیکن اس قول کی صداقت مشتبہ ہے کہ ''شاہ صاحب کی دوسری شادی ۱۱۵۷ھ میں ہوئی تھی'' (47) قرائن وشواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بیوی کی وفات کے بعد جلد ہی بی بی ارادت سے نکاح ہوگیا تھا۔ اگر دونوں واقعات میں کسی قدر وقفہ بھی ہوا ہو تب بھی نکاح ثانی ۱۱۵۷ھ سے بہت پہلے ہوا ہوگا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کا ایک ملفوظ اس خیال کا مؤید ہے، شاہ صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا:

''درشب بست و پنجم رمضان وقت سحر تولد شدہ بودم، چوں والدین راکودک بسیار مردہ بودند مگر برائے من آرزو کمال بود''۔(48)

یعنی شاہ عبدالعزیز کی ولادت سے پہلے حضرت شاہ صاحب کے والدین (شاہ ولی اللہ اور بی بی ارادت) کے

کئی بچے ضائع ہو چکے تھے، زوجہ ثانیہ کی پہلی اولاد جو حیات رہی شاہ عبدالعزیز تھے۔ اگر نکاح ثانی کا سنہ ۱۱۵۷ھ تسلیم کیا جائے تو اس وقت سے شاہ عبدالعزیز کی ولادت ۱۱۵۹ھ تک صرف ایک بچے یا حمل کے ضائع ہو جانے کا وقفہ رہتا ہے، اس میں کودک بسیار کی گنجائش کہاں؟۔

ایک بزرگ مصنف و محقق نے اس ملفوظ کی تصحیح فرمائی ہے اور والدین کی جگہ والدمن کو درست قرار دیا ہے، (49) مگر اس رائے سے بھی اتفاق مشکل ہے، کیوں کہ زوجہ اول محترمہ امۃ الرحیم کی وفات کے وقت تین بچے حیات تھے، جن میں ایک بچی جو زوجہ اولیٰ کی آخری اولاد تھی، صرف چھے مہینے کی تھی، اس لیے زوجہ اولیٰ کے بچوں کے حیات نہ رہنے کا شکوہ کیا صحیح اور برمحل ہے؟ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ تمام حوادث وآلام دوسری بیوی کو پیش آئے اور اسی میں کئی سال گزر گئے، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا بچے کی آرزو تمنا میں اضافہ ہوتا رہا، طویل وقفے کے اور بڑی اُمیدوں کے بعد زوجہ ثانیہ بی بی ارادت کے بطن سے ایک فرزند تولد ہوا جو حیات رہا، فرزند کے تولد اور صحت و عافیت کی خبر سے پورے خاندان میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے مرحوم زوجہ کے کمسن بچوں کی نگہداشت و پرورش کی ضرورت کے پیش نظر دوسرے نکاح میں عجلت فرمائی ہو، اس کا اشارہ خود شاہ صاحب کے مکتوبات میں بھی ملتا ہے، تحریر ہے:

''واز کسے مُتکفّلاتِ اولاد نماند، تشویشے لاحق شد''۔(50)

محترمہ بی بی ارادت نے خاصی طویل عمر پائی، حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے چھوٹے فرزند شاہ عبدالغنی کی وفات ۱۲۰۳ھ تک حیات تھیں، (51) تاریخ وفات معلوم نہیں۔

## (5)

## حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اولاد

دونوں بیویوں سے حضرت شاہ صاحب کی متعدد اولاد ہوئیں، جس میں سے نو کے متعلق معلومات دستیاب ہیں، اور نو میں سے سات شاہ صاحب کی وفات (۲۹/محرم ۱۱۷۶ھ/ یوم شنبہ 21 اگست 1762ء) کے وقت حیات تھیں، تفصیلات اس طرح ہیں:

زوجہ اول سے تین: ایک فرزند (۱) مولانا شاہ محمد۔ دولڑکیاں (۲) محترمہ صالحہ اور (۳) امۃ العزیز۔

زوجہ ثانیہ سے چھے: چار فرزند، (حضرت شاہ) (۱) امام الدین عبدالعزیز۔ (۲) رفیع الدین عبدالوہاب۔ (۳) معین الدین عبدالقادر۔ (۴) رضی الدین عبدالغنی۔ اور دو بیٹیاں (۵) فاطمہ اور (۶) فرخ بی بی۔

آئندہ سطور میں اولاً بیٹیوں کا ذکر آئے گا، پھر صاحبزادگان کا مختصر احوال، جس میں ان کے صحیح سن ولادت و وفات متعین کرنے کی کوشش ہوگی۔

## (۱) محترمہ صالحہ بنت حضرت شاہ ولی اللہ

حضرت شاہ صاحب کی زوجہ اول سے جو اولاد حیات رہی، ان میں سے سب سے بڑی محترمہ صالحہ ہیں، شاہ صاحب نے زوجہ اول کی وفات پر میر معین الدین کو جو خط لکھا تھا، اس کا ایک اقتباس گزر گیا ہے، دوسطریں اور پڑھ لیجئے:

''وسہ یکے دخترِ شش سالہ، دومی فرزند سہ سالہ، وسیم دخترِ شش ماہہ گذاشت، واز کسے متکفلاتِ اولاد نماند....تشویشے لاحق شد''۔(52)

اس اقتباس کی روشنی میں جو ایک اہم اور مستند ترین ذریعہ معلومات ہے، محترمہ صالحہ کا سن ولادت ۱۱۴۳ھ/ 1730,31ء تقریباً متعین ہے۔ ان کے سنہ ولادت کے علاوہ کوئی اور اطلاع راقم سطور کو نہیں ملی، مگر مولانا مجتبیٰ حیدر صاحب کاکوری نے مطلع فرمایا ہے کہ:

''ان کی شاہ ولی اللہ کی حیات میں شادی ہوگئی تھی، مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی، شاہ صاحب کے سامنے لاولد انتقال کر گئیں، اس عالم میں جو اس کا بدل ان کو عطاء ہوا، اس کی تفصیل شاہ صاحب نے عرصہ بعد بیان فرمائی''۔(53)

## (۲) محترمہ امۃ العزیز بنت شاہ ولی اللہؒ

امت العزیز عرف مسیتی زوجہ اولی کی آخری یادگار تھیں، تقریباً ۱۱۴۸،۴۹ھ/ 1738,39ء میں ولادت ہوئی، چھے مہینہ کی تھیں کہ والدہ وفات پا گئیں۔ ازدواج ونکاح کے متعلق مستند معلومات دریافت نہیں، لیکن مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جن کا نکاح شاہ ولی اللہ نے اپنے ماموں زاد بھائی اور خلیفہ اکبر شاہ محمد عاشق کے صاحبزادے سے کیا''۔(54)

اگرچہ مولانا میرٹھیؒ نے شاہ محمد عاشق کے صاحبزادے کا نام نہیں لکھا، جو اُمت العزیز کے شوہر تھے، مگر دیگر مآخذ وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ امت العزیز شاہ محمد عاشق کے بڑے صاحبزادے شاہ محمد عبدالرحمٰن (مرتب مکتوبات شاہ ولی اللہ) کے نکاح میں آئیں، اور اس ضمن میں عبدالرحیم ضیاء کی یہ اطلاع درست نہیں کہ:

''ایک دختر مسماۃ بی بی امت العزیز۔ دختر مذکورہ کی مولوی محمد فائق بن مولوی محمد عاشق سے شادی کردی''۔(55)

کیوں کہ شاہ محمد فائق، شاہ صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی بی بی فرخ کے شوہر تھے، اور اِن کا نکاح شاہ صاحب کی حیات میں ہونا اس لیے قرین قیاس نہیں کہ وہ اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ کی وفات (۱۱۷۶ھ) کے

www.rahimia.org

وقت شیرخوار دو ڈھائی سال کی تھیں، لیکن شاہ عبدالرحمٰن کا نکاح شاہ ولی اللہ کی حیات میں ہوگیا تھا اور وہ ۱۱۶۸ھ/ 1754,55ء میں انتقال کر گئے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے متعدد خطوط میں شاہ عبدالرحمٰن اور ان کی اولاد کا ذکر ہے۔ ایک خط میں تحریر ہے:

وقد وصل الولد العزیز عبدالرحمن مع اولادہ بالخیر والعافیة. (56)

''عزیزم عبدالرحمٰن اپنی اولاد کے ساتھ خیر و عافیت سے (یہاں) پہنچے''۔

اہل پھلت کے نسب ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالرحمٰن کے دو صاحبزادے ہوئے، ابوالفضل اور ثناء اللہ۔ ثناء اللہ کے بھی دو بیٹے ہوئے، محمد عثمان، محمد یوسف اور یہ وہی محمد یوسف ہیں، جو تحریک جہاد سید احمد شہیدؒ کے سرگرم رکن تھے اور جن کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے تمام تذکرہ نگار نبیرۂ شاہ اہل اللہ محمد یوسف بن عمر بن شاہ اہل اللہ لکھتے ہیں، (57) حالانکہ اس وقت تک کسی ذریعہ سے محمد عمر نامی شاہ اہل اللہ کے کسی بیٹے کے وجود کی تصدیق نہیں ہوسکی اور خانوادۂ ولی اللہی کے نسب ناموں میں بھی ان کا ذکر نہیں۔

## (۳) محترمہ فاطمہ بنت شاہ ولی اللہؒ

شاہ عبدالرحمٰن خلف شاہ محمد عاشق کی وفات (۱۱۶۸ھ) کے بعد تولد ہوئیں، ان کی ولادت کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے ایک خط میں لکھا ہے:

''از نعم الٰہی دریں ایام آنست کہ صبیہ متولد شد چوں خانہ ما از اسم فاطمہ خالی شدہ بود، ہمیشہ در خاطر ایں....میگذاشت، ایں صبیہ را ''فاطمہ'' نام کردہ شد''۔ (58)

افسوس بی بی فاطمہ کی حیات، کل عمر اور نکاح و ازدواج کے متعلق کوئی اور اطلاع راقم سطور کو نہیں ملی، چونکہ اس خط کے علاوہ کسی اور ماخذ و مکتوبات میں ان کا ذکر نہیں ملا، اس لیے خیال ہے کہ شاید وہ کمسنی میں وفات پا گئی ہوں؟

## (۴) محترمہ فرخ بی بی بنت شاہ ولی اللہؒ

حضرت شاہ صاحب کی دوسری زوجہ سے یہ آخری اولاد ہیں، صحیح سنہ ولادت معلوم نہیں، مگر حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے برادران گرامی کے سنین ولادت کی ترتیب کے پیش نظر فرخ بی بی کا سنہ ولادت تقریباً ۱۱۷۴ھ/ 1760,61ء متعین کیا جاسکتا ہے۔ فرخ بی بی شاہ محمد فائق خلف شاہ محمد عاشق کے نکاح میں آئیں، خانوادہ ولی اللہی پر قلمی یادداشت کی اطلاع ہے:

''وایں ہر چہار بزرگان معہ یک خواہر کہ در عقد نکاح شاہ محمد فائق پھلتی پسر حضرت شاہ محمد عاشق مذکور قدس سرہ بقید حیات موجود است و صاحب اولاد است''۔ (59)

اور مولانا جعفری نے شاہ عبدالعزیز کے ماموں شاہ کبیر بن صدر العالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

**وکانت زوجة فخر العالم من السادة القطبية الزكويه اولاد الامير قطب الدين الكڑی، فولدت له صدرالعالم وهو ابی و فاخرة النساء وهی ام والدة الشيخ امام الدين عبدالعزيز، والشيخ رفيع الدين عبدالوهاب والشيخ معين الدين عبدالقادر، والشيخ رضی الدين عبدالغنی، والد العالم الفاضل اسماعيل الشهيد رحمه الله و فرخ بی بی وهی زوجة الشيخ محمد الفائق بن الشيخ محمد العاشق... الخ. (60)**

بی فرخ کے متعدد اولادیں ہوئیں، نسب نامہ اہل پھلت میں محمد معصوم، محمد صادق اور عبدالسلام کا ذکر ہے۔ اول الذکر دونوں لاولد تھے۔ فاطمہ کا نکاح مولوی معظم اللہ خلف شاہ اہل سے ہوا۔ نسل چلی اور عبدالسلام کا سلسلہ بھی خاصا پھلا پھولا اور اس وقت تک برگ و بار لا رہا ہے۔

نسب نامہ اہل پھلت میں بی بی فرخ کی ان ہی مذکورہ چار اولادوں کا ذکر ہے، لیکن حضرت شاہ عبدالعزیز کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بی بی فرخ کی ایک دختر اور بھی تھیں جو اپنے والدین کی حیات میں انتقال کر گئی تھیں، محولہ بالا خط میں اسی حادثہ کی تعزیت ہے، آخر میں لکھتے ہیں:

**....يبلغوا مثل هذا التسلية الی اختی ... الله سرها و حفظها من كل سوء و بارک فيها وفی اولادها. آمين. الخ.(61)**

## (۵) مولانا شاہ محمد خلف اکبر حضرت شاہ ولی اللہؒ

حضرت شاہ صاحب کے میر معین الدین ٹھٹھوی کے نام محولہ بالا مکتوب کی رو سے جس کے اقتباسات گزر چکے ہیں، شاہ محمد کا سنہ ولادت ۱۱۴۶ھ/ 1733,34ء معلوم و متعین ہے، شاہ محمد کی تعلیم و ارشاد کی تفصیلات دریافت نہیں، تاہم اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ابتدائی کتابوں سے منتہانہ نصاب تعلیم تک اکثر کتابوں میں والد ماجد سے تلمذ و استفادہ کا موقع ملا ہوگا، شاہ محمد کی تعلیم کے ابتدائی ایام میں حضرت شاہ صاحب نے ان کے لیے ایک رسالہ **"ضوابط املاء كلمات و قواعد كتابت"** مرتب کیا تھا، (62) اس کے شروع میں لکھا ہے:

''برخوردار سعادت اطوار فرزندم محمد سلمہ اللہ تعالیٰ بداند کہ در نوشتن دو قاعدہ مستحضر باید ساخت، یکے آنکہ ہر کلمہ را جدا باید نوشت خواہ اسم باشد یا فعل یا حرف ......الخ''۔

مولانا عبدالحیؒ حسنی نے شاہ عبدالعزیز کے ایک رسالہ کی حوالہ سے شاہ محمد کو شمائل ترمذی اور حصن حصین کے درس میں شاہ عبدالعزیز کا رفیق و ہمدرس لکھا ہے، مولانا حسنی کا قول ہے:

**و (اخذ) الحصن الحصين و شمائل الترمذی سماعاً عليه بقراءة اخيه الشيخ محمد... الخ. (63)**

لیکن راقم سطور کو اس اطلاع کی تصدیق میں تامل ہے، معلوم نہیں مولانا حسنی نے یہ اطلاع کہاں سے اخذ کی، اگر شاہ عبدالعزیزؒ اس کا ذکر فرماتے تو اس اطلاع کا صحیح محل شاہ صاحب کی تالیف رسالہ عجالۂ نافعہ تھی، اس میں شاہ صاحب نے شیخ محمد کے ساتھ اشتراکِ سماعت وقراءۃ کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، بلکہ یہ لکھا ہے کہ:

''ایں فقیر ایں علم وجمیع علوم را محض از خدمت والد ماجد خود اخذ کردہ است، وبعضے کتب ایں علم را مثل مصابیح ومشکوٰۃ ومسویٰ شرح مؤطا کہ از تصانیف ایشاں است وحصن حصین وشمائل ترمذی از خدمت ایشان قراءۃ وسماعاً بہ تحقیق وتفتیش اخذ نمودہ''۔(64)

تاہم اگر شاہ محمد کی شاہ عبدالعزیزؒ کے ساتھ رفاقت ودرس کی اطلاع درست ہے تو یہ اشتراک وہم سبقی بلاشبہ تیمناً وتبرکاً ہوئی ہوگی، کیوں کہ جس وقت شاہ عبدالعزیزؒ نے (تقریباً ۱۱۷۵ھ میں) شاہ ولی اللہ سے شمائل ترمذی اور حصن حصین پڑھی، اس وقت شاہ محمد کی عمر 29,28 ہوگی، اور اس عمر تک تدریس وتعلیم میں مشغول رہنا خانوادۂ ولی اللہی کی روایات کے خلاف اور نا قابل یقین ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے مرض الوفات میں شاہ عبدالغنی کے علاوہ اپنے چاروں صاحبزادوں کی نسبت مع اللہ کی کیفیت کا اور ان کی متوقع روحانی ترقیات کا حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے ذکر کیا تھا، اس میں شاہ محمد کا تذکرہ بھی ہے، فرمایا:

''وشیخ محمد را نسبت مع اللہ مانند نسبت شاہ حسین خواہد شد''۔(65)

شاہ محمد کی زندگی کا بڑا حصہ بھائیوں کے ساتھ دہلی میں گزرا، شاہ عبدالعزیزؒ کے متعدد مکتوبات میں مکتوب الیہم کو شاہ محمد کا سلام لکھا ہے، جو اس کی واضح شہادت ہے کہ شاہ محمد، شاہ عبدالعزیزؒ کے ساتھ ہیں، (66) نیز شاہ عبدالعزیزؒ کے خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد کا افضل خاں کی چھاؤنی لکھنو میں بھی کچھ عرصہ قیام رہا ہے، (67) لیکن سید احمد ولی اللہی کے اس قول میں کچھ صداقت نہیں کہ: ''شاہ محمد ہمیشہ پھلت میں رہے'' (68)، شاہ محمد اپنے والد ماجد اور بھائیوں کی طرح بڈھانہ (ضلع مظفر نگر) بھی آتے جاتے رہتے تھے، اور یہیں کے زمانہ قیام میں ۱۲۰۸ھ/ 1793,94ء میں وفات ہوئی، اور جامع مسجد کے صحن میں دفن کئے گئے۔ منشی فرحت اللہ پھلتی نے لکھا ہے:

''ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، لاولد مر گئے، اور قبر ان کی قصبہ بڈھانہ مسجد کلاں میں ہے، تاریخ وفات ''دخل الجنة'' ہے''۔(69)

منشی فرحت اللہ کے نقل کئے ہوئے فقرہ تاریخ میں سہو کاتب سے لفظ ''فی'' ترک ہوگیا ہے، موجودہ صورت میں اس کے اعداد گیارہ سو آٹھ ہیں جو اس خاندان کی کسی معروف شخصیت کی تاریخ ولادت ہے نہ تاریخ وفات، اگر فقرہ تاریخ ''دخل فی الجنة'' ہو تو اس کے اعداد بارہ سو آٹھ ہو جاتے ہیں، جو مولانا شاہ محمد کا سن وفات ہے، یہی سنہ مولانا عبدالحئ حسنی نے بھی لکھا ہے۔(70)

مولانا شاہ محمد کی قبر جامع مسجد بڈھانہ (71) کے شمال مشرقی کونے میں حوض اور وضو خانہ کے درمیان واقع ہے، اس جگہ کل تین قبریں ہیں، کونسی قبر کس کی ہے، متعین طور پر معلوم نہیں، تاہم اس میں ایک قبر بے شک وشبہ شاہ محمد کی ہے، ایک اور قبر کے متعلق بعض اہل بڈھانہ کا قول ہے کہ وہ شاہ نوراللہ بڈھانوی کی ہے، تیسری کا حال معلوم نہیں۔

شاہ محمد کا شاہ نوراللہ کی دختر صبیحہ سے نکاح ہوا، اور لاولد فوت ہوئے، مگر عبدالرحیم ضیاء کے بیان سے شبہ ہوتا ہے کہ مولانا شاہ محمد کے دو بیٹے تھے، جو شاہ محمد کے برابر آسودہ خاک ہیں، (72) لیکن یہ قول صحیح نہیں، عبدالرحیم ضیاء کے علاوہ کوئی اور تذکرہ نگاران کی اولاد کا ذکر نہیں کرتا، اگر شاہ محمد صاحبِ اولاد ہوتے تو خانوادہ ولی اللہی پر قدیم یادداشت اور مولانا جعفری کی کتاب سے اس کا کوئی اشارہ و تذکرہ ملتا، مگر یہ دونوں اس تذکرہ سے خاموش ہیں، نیز منشی فرحت اللہ پھلتی (73) اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (74) نے مولانا محمد کو صراحتاً لاولد لکھا ہے اور نسب نامہ اہل پھلت بھی اسی مؤخر الذکر روایت کا مؤید ہے۔

## (۶) سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز، امام الدین

۲۵ر رمضان المبارک سنہ ۱۱۵۹ھ/ 12 اکتوبر 1746ء کو ولادت ہوئی، خود شاہ عبدالعزیز کا ارشاد ہے:

''در شب بست و پنجم رمضان وقت سحر تولد شدہ بودم''۔ (75)

غلام حلیم (اعداد: 1159) تاریخی نام ہے، (76) والد ماجد اور شاہ محمد عاشق نیز شاہ نوراللہ بڈھانوی سے تعلیم حاصل کی، حضرت شاہ ولی اللہ نے شاہ عبدالعزیز کو مبادیاتِ صرف کی تعلیم و تفہیم کے لیے ایک منظوم رسالہ فارسی میں تحریر فرمایا تھا، اس کے کلمۂ افتتاح میں لکھتے ہیں:

''و بعد ..... فقیر ولی اللہ عفی عنہ چوں فرزند ارجمند عبدالعزیز ..... تعالیٰ وفقہ لما یحب و یرضی ..... مشغول شد، مناسب نمود کہ قواعد منورہ ایں فن را در رشتہ ..... الخ ..... باسہل وجہ ضبط آں میسر آید، بہ نسخہ صرف مولانا نورالدین جامی قدس سرہ توجہ افتادہ دیدہ شد کہ قلیلے ازاں قواعد منظوم فرمود و بعضے آخر ..... گذاشتہ، ظاہراً آں استاد نامدار بعد تسوید نسخہ مذکورہ بنظر ثانی اصلاح نفرمودہ و توجہ آں نگاشتہ، لاجرم بعضے ابیات تیمناً و تبرکاً بعینہا آوردہ شد، و در بعضے تصرفے بحسب امکان کردہ آمد، و بعضے آخر بر بیان اسلوب و وزن زیادہ کردہ شد''۔ (77)

حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد ان کے تمام مناصب اور ذمہ داریوں کا بوجھ شاہ عبدالعزیز کے کاندھوں پر آ گیا تھا، اور شاہ عبدالعزیز نے اپنی کمسنی کے باوجود یہی نہیں کہ اس کا شایانِ شان حق ادا کیا، بلکہ ہر لحاظ سے اس کو چار چاند لگادیئے، اپنے چھوٹے بھائیوں کی ایسی رہنمائی اور تعلیم و تربیت فرمائی کہ باید و شاید۔ حالانکہ شاہ ولی اللہ کی

www.rahimia.org

وفات کے وقت شاہ عبدالعزیز کی عمر صرف سولہ سال چند مہینے تھے، اور اس وقت شاہ رفیع الدین تیرہ سال کے، شاہ عبدالقادر نو سال کے، اور شاہ عبدالغنی پانچ سال کے تھے۔ اگر شاہ عبدالعزیز اپنے بھائیوں کی ایسی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے علاوہ زندگی بھر اور کوئی علمی دینی خدمت سرانجام نہ دیتے تو بھی ان کا یہی ایک کارنامہ رہتی دنیا تک ان کے کلاہِ عزت و افتخار میں نگینہ کی طرح چمکتا رہتا اور ہمیشہ ان کی یاد تازہ رکھتا، مگر شاہ عبدالعزیز کی خدمات کا دائرہ اس سے بہت وسیع، بہت عمیق، بہت متنوع اور نہایت کثیر الجہت ہے۔

شاہ عبدالعزیز کے حلقہ تعلیم و تربیت سے بے شمار ایسے بلند قامت انسان اُٹھے کہ ان کا طرہ فضل و کمال غزالی و رازی سے آنکھیں ملاتا تھا، اور جن کی مجالس درس اپنی وسعت اور اثر و نفوذ میں علمائے متقدمین کی یاد تازہ کراتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک فضل و کمال کا منبع اور علم و ارشاد کا سرچشمہ تھا، ان کا وجود ہندی ملت اسلامیہ کے لیے سرمایہ فخر و مباہات اور وجہِ نازش و افتخار تھا، پچھلے دو سو برس کی تاریخ میں اور آج بھی برصغیر ہند، پاکستان اور بنگلہ دیش کا کون مسلمان ہے جو ایمان و عقائد کی اصلاح اور طریقہ ہدایت و سنت کی دریافت اور پیروی میں ان بزرگوں کے خوانِ علم کا خوشہ چین اور ممنون کرم نہیں، اور اس برصغیر کے کس ادارہ اور تحریک کے اصلاحی، تعلیمی نظریات کا رشتہ شاہ عبدالعزیز یا ان کے حلقہ تلامذہ سے وابستہ نہیں، بلاشبہ اس براعظم کی گزشتہ دو سو برس کی دینی، علمی، اصلاحی، تصنیفی اور فکری تاریخ شاہ عبدالعزیز کی خدمات و اثرات کی تاریخ ہے، اور ہندی ملت اسلامیہ کا ہر ادارہ، تعلیم و تبلیغ کا ہر مرکز، اور ارشاد و تلقین کا ہر اک حلقہ، چاہے اس کو اس وقت کچھ بھی رنگ اور نام دے دیا گیا ہو وہ فیضانِ عزیزی کا ایک ثمر ہے۔

شاہ عبدالعزیز ہندوستان کی ملت اسلامیہ کا وہ مہر منیر، وہ نیر تاباں اور وہ گوہر شب تاب ہے، جس کے دم قدم سے ہندوستان میں اسلام کا ٹمٹماتا چراغ روشن، توحید کا غلغلہ بلند اور اتباعِ سنت کا ولولہ تازہ ہوا، ان کی کاوشوں کا عکس آج بھی دل فروز اور ملت کے لیے مینارۂ نور ہے اور بے شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ اس برصغیر کے بیشتر تعلیمی و تبلیغی سلسلے انھیں کے سوزِ دروں کی بازگشت اور انہیں کی کاوشوں کا پرتو ہیں، جس کے اثرات سے ہندو پاکستان اور بنگلہ دیش کا خطہ خطہ منور اور ذرہ ذرہ درخشاں ہے:

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

## شاہ عبدالعزیز کا صحیح سنہ وفات

شاہ عبدالعزیز نے اکیاسی سال کی عمر میں ۷رشوال سنہ ۱۲۳۹ھ/ 6 جون 1824ء کو رحلت کی، احمد علی بجنوری نے جو اس المیہ کا عینی شاہد ہے، اپنی ایک تحریر میں اس وقت کی دیدہ و شنیدہ تفصیلات قلم بند کی ہیں، اس میں یہی سنہ وفات درت ہے۔ مولانا محبوب علی جعفری، نیز اکثر شعراء اور تذکرہ نگاروں نے بھی یہی سنہ وفات بیان کیا ہے،

مولانا جعفری لکھتے ہیں:

**مات الشیخ عبدالعزیز فی السابع من شوال سنة تسع و ثلاثین و مأتین و الف. (78)**

مؤمن کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ فرطِ شہرت سے محتاج تعارُف نہیں، یہاں اس کا صرف آخری شعر (79) پڑھ لیجئے:

دست بے داد اجل سے بے سروپا ہوگئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی نے بطریق تخرجہ تاریخ (80) کہی:

حجۃ اللہ ناطق و گویا شاہ عبدالعزیز فخر زمن
مہر نصف النہار در عرفان مثل بدر منیر در ہمہ فن
روز یک شنبہ ہفتم شوال درمیان بہشت ساخت وطن
از سر لطف و حلم تاریخش رضی اللہ عنہ گفت حسن

لیکن مذکورہ بالا تصریحات اور کثیر شواہد کو نظر انداز کر کے بعض شعراء اور تذکرہ نگاروں نے شاہ صاحب کا سنہ وفات ۱۲۳۸ھ، ۱۲۴۰ھ اور بعض نے ۱۲۴۸ھ بھی نقل کیا ہے، مگر یہ تینوں اور شاہ صاحب کے سنہ وفات کی ۱۲۳۹ھ کے علاوہ اگر کوئی اور روایت ہو تو وہ بھی یکسر غلط اور قطعاً بے اصل ہے، ۱۲۳۸ھ اور ۱۲۴۰ھ کی سب سے پہلی روایت سعادت یار خان رنگین سے منقول ہے، رنگین نے قطعۂ تاریخ (81) کہا ہے:

بہر اوج حضرت عبدالعزیز اس کی یہ تاریخ رنگین نے لکھی
منظر خلد بریں کا قصر تھا شبلی ہند اور جنید عصر تھا

شاہ صاحب کے لوحِ مزار پر اول یہی سنہ وفات کندہ تھا (82)، جب قدیم کتبات تبدیل کئے گئے اس وقت صحیح سنہ وفات درج ہوا، رنگین نے ایک اور فقرۂ تاریخ بھی لکھا ہے: ''ہے مرا آج امام اعظم عہد''۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں۔ ۱۲۴۸ھ کی روایت سرسید احمد نے آثار الصنادید میں ذکر کی ہے، سرسید کے الفاظ یہ ہیں:

''۱۲۴۸ھ (بارہ سو اڑتالیس ہجری) میں اس جہانِ فانی سے سفر آخرت کو اختیار کیا''۔ (83)

مولوی رحیم بخش نے حیات ولی میں بھی یہی سنہ لکھا ہے (74)، مگر دونوں سے یہ غلطی سخت حیرت انگیز ہے، کیوں کہ دونوں نے اپنی ان تحریرات کے بعد جو قطعاتِ تاریخ نقل کئے ہیں، ان سے صحیح سنہ وفات ۱۲۳۹ھ صاف عیاں ہے، خصوصاً مولوی رحیم بخش کا بیان محل تعجب ہے، وہ حیاتِ ولی کی تالیف سے پہلے اپنی کتاب حیاتِ عزیزی میں صحیح سنہ وفات لکھ چکے تھے، (85) اور لطف یہ ہے کہ حیاتِ عزیزی میں دو قطعات تاریخ ہیں اور حیاتِ ولی میں تین اور ان میں سے ہر ایک قطعہ تاریخ سے صحیح سنہ وفات ۱۲۳۹ھ برآمد ہوتا ہے، (86) نیز حیاتِ عزیزی میں ایک

قطعۂ تاریخ کے نیچے صحیح اعداد درج ہیں، لیکن حیاتِ ولی میں مولانا ابوالحسن حسن کے قطعۂ تاریخ کے نیچے اس کے اعداد ۱۲۴۸ھ لکھ دیئے جو بالکل غلط ہیں۔

شاہ عبدالعزیز کی تاریخ ولادت، عمر اور سنہ وفات تینوں ایک ہی فقرہ سے معلوم ہو جاتے ہیں، غلام حلیم (اعداد: ۱۱۵۹ھ) تاریخ پیدائش ہے، لفظ عطاء (اعداد: ۸۱) سنہ وفات کا مظہر ہے۔ (87)

## ازدواج اور اولاد

شاہ عبدالعزیز کا شاہ نوراللہ بڈھانوی کی دختر حبیبہ سے نکاح ہوا، نکاح و ازدواج کا سنہ معلوم نہیں، مگر حضرت شاہ ولی اللہ کی حیات میں اس رشتہ کی بنا ڈال دی گئی تھی، اس رشتہ کے سلسلہ میں شاہ صاحب نے شاہ نوراللہ کو جو خط لکھا تھا وہ مجموعہ مکتوباتِ شاہ ولی اللہ میں شامل ہے۔ شاہ ولی اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''بالجملہ ایں علاقہ کہ بابت نسبت برخوردار محمد متجدد شد، باعلاقہ اولیٰ بابت نسبت عبدالعزیز چہ قدر بہجت خاطر دارد..... الخ۔ (88)

محترمہ حبیبہ سے شاہ صاحب کی متعدد اولادیں ہوئیں، ہمیں چھ بچوں کا علم ہوسکا ہے، تین بیٹے، تین بیٹیاں، تینوں بیٹے کمسنی میں وفات پاگئے تھے، لڑکیوں کے نکاح ہوئے، اولاد ہوئی اور پھر یکے بعد دیگرے تینوں صاحبزادیاں اپنے والد کی حیات میں رحلت کر گئیں، اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرحت اللہ پھلتی نے لکھا ہے:

''ان (شاہ عبدالعزیز) کی اولاد ان کے روبرو مر گئی''۔ (89)

شاہ عبدالعزیز کے متعلق سید احمد ولی اللہی کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ: ''آپ سے کوئی فرزند نرینہ نہیں ہوا'' (90) شاہ صاحب کے تین صاحبزادے تھے، قطب الدین، زین الدین اور احمد۔ قطب الدین نے بارہ تیرہ سال کی عمر میں وفات پائی، زین الدین نے بھی اسی عمر میں تقریباً ۱۲۳۴ھ میں انتقال کیا، احمد کی عمر اور سنہ وفات معلوم نہیں۔ مگر شاہ صاحب کی ایک تحریر کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ احمد اور ان کی والدہ محترمہ دونوں کا شاید ایک ہی زمانہ میں انتقال ہوا، شاہ صاحب نے لکھا ہے:

**وان سألتم عنا فنحن ایضاً بحمد الله بعافیة و رفاهیة غیر ان ماجری فینا من تقدیرات الله تعالیٰ (رحلة) الولد العزیز احمد و اختلال الانتظام المنزلی اوجب لنا الذهول عن اکثر ماتهم به و من ثم وقع نبذ من التاخیر فی ارسائل الرسائل. (91)**

شاہ صاحب کی دختران کی تفصیل اس طرح ہے: عائشہ، رحمت النساء اور مریم۔ (92)

(۱) **عائشہ:** شیخ محمد افضل رہتکی کے نکاح میں آئیں، شیخ محمد افضل شاہ ولی اللہ کے ہم جد تھے، ان کا نسب چار واسطوں کے بعد نسب نامہ ولی اللہی سے مل جاتا ہے، عائشہ کے دو فرزند تھے، حضرت شاہ محمد اسحاق اور شاہ

www.rahimia.org

محمد یعقوب، اور ایک دختر مسماۃ مبارک، ان کا شاہ عبدالحئی بڑھانوی کی زوجہ اولیٰ مریم کی وفات کے بعد شاہ عبدالحئی سے نکاح ہوا، منشی فرحت اللہ پھلتی کا بیان ہے کہ:

''مسماۃ مبارک کی شادی ہوئی، مولانا عبدالحئی صاحب سے، بعد فوت ہو جانے مریم کے، اور بعد دو سال کے روبرو شوہر و نانا خود لاولد مرگئیں'۔(93)

(۲)**رحمت النساء:** دختر اوسط، شاہ رفیع الدین کے فرزند مولوی محمد عیسیٰ سے منسوب ہوئیں، اور اپنے شوہر کی وفات کے بعد ۱۲۳۶ھ/ 1820,21ء میں لاولد انتقال کر گئیں۔ مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی نے تاریخ (94) کہی:

مخدومہ خلق حیف صد حیف حسن چوں رخت ازیں جہانِ فانی بربست

تاریخ وفات او بگفتا ہاتف بی بی رحمت ''برحمت حق پیوست''

(۳)**مریم:** سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں، شاہ عبدالحئی بڑھانوی کے نکاح میں آئیں، اور لاولد انتقال کر گئیں۔

## (۷) حضرت شاہ عبدالوہاب، رفیع الدین

۱۹/ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ/ 19 نومبر 1750ء منگل کے دن پیدا ہوئے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس مبارک و مسعود ولادت کا اپنے ایک خط میں تفصیل سے ذکر کیا ہے اور نومولود کی وجہ تسمیہ پر بھی روشنی ڈالی ہے، شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

"**یوم الثلاثاء تاسع عشر ذی الحجه وقت الضحوة الکبریٰ** فرزندے عطا فرمود، چوں پیش از حمل آں والدہ اش مریض بود، وتوقع شفا بحسب عادت منقطع شدہ، میاں نوراللہ در واقعہ شفا مشار الیہا وتولد فرزند مبشر شدہ بودند، و در آں واقعہ بخاطر ایشاں نشستہ بود کہ نام مولود رفیع الدین باشد، مانند جدے لامِ حضرتِ ما قدس اللہ اسرارہما۔

و نیز یک روز در ضمن تلاوت ''اسم وہاب'' بعض نعم الٰہی را کہ درحق ایں مسکین مقدر شدہ مشاہدہ شود از آں جملہ ایں ولد نیز مشتمل شد، بملاحظہ ادب ہر دو واقعہ ''رفیع الدین عبدالوہاب'' نام ایں مقرر کردہ شد، خدائے تعالیٰ او را تربیت فرماید بوجہے کہ مرضی او تعالیٰ شود، و شائستہ حملِ امانت گردد انہ قریب مجیب''۔(95)

شاہ ولی اللہ کی وفات کے وقت شاہ رفیع الدین کی عمر تیرہ سال تھی، اور وہ شرح جامی وغیرہ پڑھتے تھے، ابتدائی کتابوں کی تعلیم کا صحیح حال معلوم نہیں، مگر والد ماجد کی وفات کے بعد تمام درسیات شاہ عبدالعزیز سے اخذ کیں، اور

www.rahmia.org

سلوک و معرفت میں شاہ محمد عاشق پھلتی سے استفادہ کیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کے بعض مکتوبات میں شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی کی تعلیم کا کچھ حال درج ہے، ان خطوط سے ان بزرگوں کی تعلیمی کیفیت اور ان کی صلاحیت و استعداد کی روز افزوں ترقی کے علاوہ اس عہد کے طریقہ تعلیم، خصوصاً ولی اللہی طریقِ درس کے مختلف مراتب و مراحل کی ایسی عمیق اور ہمہ جہت تصویر سامنے آتی ہے، جو ہمارے حلقہ ہائے درس میں ایک زمانہ سے مفقود ہے۔ اگرچہ ان خطوط کے متعلقہ اقتباسات خاصے طویل ہیں، مگر بتمام و کمال لائق مطالعہ ہیں، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

**ان اخی رفیع الدین کان مشغولاً بالفوائد الضیائیه و تعلیقات الکافیه اذ هجمت هذه الواقعه التی اطارت الالباب و اسطالت علی القلوب و الاکباد، فوفقنی الله تعالیٰ بضبطهم و رعیتهم الی هذا الشان و حثهم علی تحصیل العلم و اخذه بکل لسان، فاثر ذالک فیهم و اشتغلوا بقراءة الکتب و سماعها علی هذا الفقیر فجاء وا الحمدلله کما تشتهیه القلوب و تلذ الاعین.**

''میرے بھائی رفیع الدین، اللہ ان کو سلامت رکھے، فوائد ضیائیہ (شرح جامی) اور تعلیقات کافیہ پڑھ رہے تھے کہ والد ماجد کی وفات کا جانکاہ اور ہوش ربا واقعہ پیش آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ میں نے سب بھائیوں کو تحصیل علم اور ہر رائج الوقت زبان سیکھنے کی ترغیب دی، چنانچہ ان پر میری ترغیب کا اثر ہوا اور وہ اس فقیر کے پاس کتابوں کے پڑھنے اور سننے میں مشغول رہے، تا آنکہ الحمدللہ حسب دل خواہ ایسی استعداد پیدا کی، جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں''۔

**اما رفیع الدین فقد حفظ القرآن کله و فرغ بحمدالله من تحصیل العلوم کلها لاسیما الادبیة والفلسفیة والاصلین من العلم الدینیة بل اخذ من العلوم الغریبة کالهیئة والنجوم والحساب والهندسة و ما یجری مجراها من الرمل والجفر والتاریخ و علم الفرائض والشعر ورسائل التصوف بحظ وافر، و بقی له العبور علی الصحاح الستة و غیرها من کتب الحدیث و عسیٰ ان یوفقه الله تعالیٰ لذالک ایضاً، وهو بحمد الله مشغول بتفسیر البیضاوی و مشغوف بالتدریس وله تعلیقات و تدقیقات تقرّبها العین و یسرّ بها الصدر. فالحمد لله علی ذالک.**

''بہر حال رفیع الدین نے قرآن شریف حفظ کرلیا ہے اور وہ بحمداللہ تمام علوم کی تحصیل سے فارغ ہو چکے ہیں، خاص طور پر علومِ ادبیہ اور فلسفہ اور علومِ دینیہ کی دونوں اصلوں (قرآن و حدیث) میں ان کو تخصص حاصل ہے، بلکہ انہوں نے علومِ غریبہ بھی حاصل کئے ہیں، جیسے ہیئت، نجوم اور حساب، ہندسہ اور

جو ان کے ملحق و متصل ہیں، جیسے رمل، جفر، تاریخ، فرائض، شعر، نیز رسائل تصوف بھی پڑھے ہیں اور ان کو ان علوم میں پورا پورا حصہ ملا ہے۔ اور ابھی ان کی صحاح ستہ وغیرہا پر عبور یعنی دورہ حدیث باقی ہے، اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب اس کی بھی توفیق عطا فرمائے گا۔ اللہ کے فضل و کرم سے وہ اس وقت تفسیر بیضاوی پڑھ رہے ہیں، اور درس و تدریس کا بھی شغف رکھتے ہیں اور ان کے قلم سے بعض کتابوں اور علوم و مباحث پر تعلیقات و تحقیقات بھی ہیں، جن سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور ہوتا ہے۔ والحمد لله علیٰ ذالک''۔

**واما عبدالقادر، فهو ایضاً فرغ بحمد الله من حفظ القرآن كله و اسمع فی التراویح مرات وهو الآن مشغول بالقطبی و حواشی السید علیه.**

**واما عبدالغنی فقد حفظ نصف القرآن الكريم وهو مشغول به. (96)**

''اور عبدالقادر وہ اللہ کے فضل و کرم سے قرآن حفظ کر چکے ہیں، اور کئی مرتبہ تراویح میں سنا چکے ہیں۔ اس وقت وہ قطبی اور اس پر سید شریف کا حاشیہ پڑھ رہے ہیں۔

اور عبدالغنی نے آدھا قرآن شریف حفظ کرلیا ہے، اور وہ ابھی اسی میں مشغول ہیں''۔

اگرچہ شاہ صاحب کے اس مذکورہ بالا خط پر سنہ کتابت درج نہیں، مگر اس کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے ڈیڑھ دو سال بعد لکھا گیا ہے، اس خط کی تحریر کے کچھ عرصہ بعد ایک اور خط میں تینوں بھائیوں کی تعلیمی مصروفیات پر کچھ اور روشنی ڈالی ہے، ان بزرگوں کی تعلیم و تدریس کے وقت اس خط کو نظر انداز کیا جانا قرین انصاف نہیں۔ شاہ صاحب اس خط میں لکھتے ہیں:

''رفیع الدین بفضل الٰہی از تحصیل علوم فارغ شدہ، درمجلس عرس کہ مجمع علماء وفقراء بود، دستارِ تبرک بستہ، اجازت درس دادہ شد، الحمدللہ مردم بسیارے از وے مستفید اند''۔

وعبدالقادر ہم اکثر کتب تحصیل را خواندہ است بمرتبہ فضیلت رسیدہ ان شاء اللہ ببرکت ارواح طیبہ عن قریب فارغ التحصیل خواہد شد۔

عبدالغنی قرآن را ختم نمودہ در رمضان المبارک گزشتہ درمحراب ایستادہ شد، باہتمام تمام در حفظ قرآن شریف اہتمام نمود، الحال کتب فارسی شروع کردہ است، بعد ماہ مبارک آئندہ قصد ہست کہ شروع در صرف ونحو کنانیدہ خواہد شد''۔(97)

ترجمہ: ''رفیع الدین خدا کے فضل سے تعلیم سے فارغ ہوگئے ہیں، ایک یادگار مجلس میں جس میں علماء اور درویشوں کا ہجوم تھا، دستارِ تبرک باندھ کر ان کو درس کی اجازت دے دی گئی ہے، خدا کا شکر ہے بہت سے افراد ان کے علم اور تعلیم سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

www.rahmia.org

اور عبدالقادر نے بھی درسی کتابوں کا اکثر حصہ پڑھ لیا ہے اور فضیلت تک پہنچ گئے ہیں، خدا نے چاہا تو وہ بھی ارواح طیبہ کی برکت سے عنقریب رسمی تعلیم سے فارغ ہو جائیں گے۔

عبدالغنی نے قرآن شریف ختم کیا ہے، پچھلے رمضان مبارک میں پہلی محراب سنائی اور قرآن شریف حفظ کرنے میں خوب کوشش کی ہے، اب انہوں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھنی شروع کی ہیں، اگلے رمضان کے بعد ارادہ ہے کہ ان کو نحو وصرف شروع کرادی جائے۔

## شاہ رفیع الدینؒ کا سنِ وفات

شاہ رفیع الدین کی ستر سال کی عمر میں، طاعون کی مرض میں ۳ر شوال ۱۲۳۳ھ/ 9 اگست 1818ء کو وفات ہوئی، مولانا محبوب علی جعفری لکھتے ہیں:

**مات (الشیخ رفیع الدین) فی السادس من شوال سنة تسع و ثلاثین و مائتین و الف فی الوباء. (98)**

عنبر خاں عنبر رامپوری نے تاریخ (99) کہی:

سپہر معرفت مہر طریقت مہہ اوج ہوا صندید باقی
نمایاں کوکب برج شریعت فروزاں اختر اُمید باقی
بچرخ شرع حق نجم ہدایت بشمسِ ورع نورِ دید باقی
بگردونِ طریقت طرفۂ کوکب بچرخِ اتقا ناہید باقی
بافلاک علوم و دین و ملت مضٰی سیارہ تائید باقی
درخشاں آفتابِ زہد و تقویٰ رفیع الدین کہ شد جاوید باقی
چو از دورِ فلک زیر زمین شد بود تاریخ(۱۲۳۳) او ''خورشید باقی''

چشمۂ فیض (اعداد:۱۲۳۳) سے بھی سنہ وفات معلوم ہوتا ہے۔

ملفوظات شاہ عبدالعزیز کا مرتب جو رجب ۱۲۳۳ھ سے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر تھا اور شاہ صاحب کے ملفوظات کی جمع وترتیب میں مشغول تھا، وہ شاہ رفیع الدین کے مرض الموت، وفات اور تدفین اور اس حادثہ پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے تاثرات کی دیدہ وشنیدہ تفصیلات ذکر کرتا ہے، (100) اس لیے مذکورہ بالا سنہ وفات بلاشک وشبہ صحیح ہے، اس سنہ کے علاوہ شاہ رفیع الدین کے سنہ وفات کی جو روایتیں نقل کی گئی ہیں، مولوی فقیر محمد جہلمی اور رکن الدین نظامی نے ۱۲۳۸ھ لکھا ہے، (101) ابویحییٰ امام خاں نوشہروی ۱۲۴۹ھ کہتے ہیں، (102) مگر یہ تمام روایات بے اصل اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔

www.rahimia.org

## ازدواج ونکاح

شاہ رفیع الدین کے تین نکاح ہوئے، پہلا اپنی ماموں زاد عارفہ بنت شاہ صدر العالم سے، زوجہ ثانیہ کا نام و نسب معلوم نہیں، تیسری بیوی کا نام کلوتھا مگر ان کا بھی نسب اور تفصیلات مفقود ہیں۔شاہ صاحب کثیر الاولاد تھے، اہل پھلت کے نسب نامہ میں دس اولادوں کا ذکر ہے، جو جوان اور صاحب اولاد تھیں۔ یہاں سب کا تذکرہ غیر ضروری ہے، مگر دو بیٹوں اور ان کی اولاد سے صرفِ نظر کرنا غلط ہوگا۔ یہ فرزند مولوی محمد موسیٰ اور مولوی محمد حسین تھے، ان دونوں کے ذریعہ سے شاہ ولی اللہ کی پسری اولاد کا سلسلہ جاری رہا، اوراس وقت تک اسی طرح پر بہار وثمر بار ہے۔

(۱) مولوی محمد موسیٰ: (ازبطن زوجہ اولیٰ) نے دو نکاح کئے، پہلا کلثوم عبدالغنی سے، ان سے ایک دختر فاضلہ پیدا ہوئیں، دوسرا سادات سونی پت میں امت السلام سے ہوا، ایک فرزند عبدالسلام زوجہ ثانیہ سے تولد ہوئے جو۱۲۹۳ھ تک حیات تھے۔(103) عبدالسلام کی اولاد کا سلسلہ خاصا وسیع اور 1947ء تک رواں دواں تھا، مگر اس کے بعد ان کا حال معلوم نہیں کہ وہ سونی پت سے کب اور کہاں منتقل ہوگئے۔

مولوی موسیٰ کی ایک دختر جو عبدالسلام کی ہمشیر تھیں، سید معزالدین سونی پتی سے منسوب ہوئیں، ان کے دو بیٹے تھے، سید معین الدین احمد اور سید ظہیر الدین احمد ولی اللہی (ناشر تصنیفات خانوادۂ ولی اللہی ومؤسس مطبع احمدی، دہلی) (104) دونوں اولاد نرینہ سے محروم تھے۔اول الذکر کی ایک بیٹی امت العائشہ تھیں، جو سید عبدالغنی سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کی والدہ ماجدہ تھیں۔

(۲) مولوی محمد حسن کا نکاح پھلت میں ہوا، وہ اور ان کی اولاد پھلت میں مقیم رہے، ان کے فرزند مولوی احمد حسن بھی صاحبِ اولاد تھے، اخلافِ شاہ رفیع الدین کی یہ شاخ بھی ثمر و بارآور رہی اور اب تک شاداب وپُر بہار ہے، مولوی احمد حسن کے پوتے پڑپوتے 1947ء کے بعد پاکستان چلے گئے تھے اور راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ (105) راقم السطور کی معلومات کے مطابق مولوی احمد حسن کے اخلاف خاندان شاہ وجیہ الدین کی واحد شاخ ہے، جواس وقت تک موجود ہے اوراس کا سلسلہ نسب بیٹوں کے ذریعہ شاہ صاحب سے منسلک ہے۔

## (۸) حضرت شاہ عبدالقادر، معین الدین

شاہ عبدالقادر کے سنہ ولادت کا معاصر تحریرات شاہ صاحب کے تلامذہ یا قریب العہد تذکرہ نگاروں نے کوئی ذکر نہیں کیا، غالباًاس ضمن میں اولین اطلاع سید احمد ولی اللہی کا یہ قول ہے کہ:''آپ ۱۱۶۷ھ میں پیدا ہوئے''۔ (106) متاخر تمام تذکرہ نگار اسی روایت کے ناقل ہیں۔ اوپر گزر گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ کی وفات کے وقت شاہ عبدالقادر کی عمر نو سال تھی، اور وہ قرآن شریف پڑھ رہے تھے،تعلیم کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے درسیات شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین سے اخذ کیں، سلوک و معرفت میں خواجہ میر درد سے استفادہ کیا، (107)

www.rahimia.org

شاہ عبدالعدل (108) سے بیعت ہوئے اور اجازت وخلافت سے نوازے گئے۔(109)

شاہ عبدالقادر نے تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۹/ رجب ۱۲۳۰ھ/ 28 جون 1815ء کو بدھ کے دن ظہر کے وقت اس دارِ فانی سے رحلت کی، خانوادۂ ولی اللہی پر قدیم یادداشت (110) کا بیان ہے:

''وفات شریف حضرت شیخ عبدالقادر قدس سرہ، نوزدہم رجب وقت ظہر روز چہار شنبہ ۱۲۳۰ھ''۔

مولانا محبوب علی جعفری نے بھی متعدد موقعوں پر شاہ صاحب کا سنہ وفات ذکر کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

**والشیخ عبدالقادر مات فی التاسع عشر من رجب سنة ثلاثین و مأتین والف.** (111) (۱۹/ رجب ۱۲۳۰ھ)

''آفتاب دیں برفت'' سے سنہ وفات برآمد ہوتا ہے، بعض اور فقرات تاریخ بھی نقل کئے گئے ہیں، مگر ان کے اعداد سنہ وفات سے مطابقت نہیں کرتے۔ شاہ عبدالقادر کے سنہ وفات کی چند اور روایتیں بھی نقل کی جاتی ہیں، جناب غلام رسول مہر نے ۱۲۲۸ھ سنہ وفات لکھا ہے، (112) مفتی غلام سرور لاہوری اور مولوی ابویحییٰ امام خاں نے ۱۲۴۲ھ بیان کیا ہے، (113) اور مولوی ابویحییٰ کی ایک اور تحریر سے اگر وہ سہو کتابت نہیں، ۱۲۴۳ھ معلوم ہوتا ہے، (114) لیکن مستند معاصر تحریرات و ماخذ کی موجودگی میں ان روایات کی چنداں اہمیت نہیں۔

## ازدواج ونکاح

شاہ عبدالقادر کی اہلیہ محترمہ کا نام معلوم نہیں ہوا، شاہ صاحب کی واحد اولاد ایک صاحبزادی زینب یا زینت تھیں، جو شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے مولوی محمد مصطفیٰ تحیر (115) سے منسوب ہوئی، ان کی بیٹی جمیلہ شاہ محمد اسماعیل شہید کے نکاح میں آئیں۔(116)

## (۹) حضرت شاہ عبدالغنی، رضی الدین

معروف روایات کے مطابق ۱۱۷۱ھ/ 1757,58ء میں پیدا ہوئے، حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے وقت پانچ سال کی عمر تھی، اگرچہ درسیات کی تمام کتابیں بھائیوں سے پڑھیں مگر حدیث مسلسل بالاولیۃ کی اجازت اور سند خود حضرت شاہ ولی اللہ سے حاصل کی تھی، (117) حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی نے جو شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے رفیق وہم سبق تھے، شاہ عبدالغنی سے مسلسل بالاولیۃ کی اجازت حاصل کی، مفتی صاحب کی بیاض میں یادداشت تحریر ہے:

**حدیث مسلسل بالاوّلیة: وھو اول ماسمعته من الحدیث، حدثنا الشیخ عبدالغنی رحمه اللہ عن ابیه الشاہ ولی اللہ المحدث وھو اول ما سمعه منه، وھو یروی (عن) السید عمر بن بنت الشیخ عبداللہ البصری المکی.** (118)

مفتی الٰہی بخش کے ذریعہ اس سلسلہ سند کا فیضان عام ہوا، مفتی صاحب سے مولانا محمد حسن رامپوری کو اجازت سند ملی، مولانا محمد حسن سے مولانا شیخ محمد تھانوی کو پہنچی۔ مولانا شیخ محمد نے لکھا ہے:

**الحدیث المسلسل بالاولیة من الاساتذہ رحمهم الله هو اول حديث سمعته من افضل الزمن الفاضل الكامل شيخنا و استاذنا مولانا محمد حسن انصاری رامفوری، وهو اول ما سمعه من شيخه الفاضل البارع الكامل الداعی الی طريق رب العرش مولانا مفتی الٰهی بخش الجهنجهانوی ثم الكاندهلوی، قال حدثنی الشيخ عبدالغنی ولد المحدث الدهلوی الحافظ الحاكم مولانا احمد المعروف بشاہ ولی الله...الخ. (119)**

## شاہ عبدالغنی کا سنہ وفات

شاہ عبدالغنی جو اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، سب سے کم عمر پائی، نوجوانی میں تینتیس سال کی عمر میں وفات پا گئے تھے، شاہ صاحبان کی قریب العہد تحریرات شاہ عبدالغنی کے سنہ وفات کے تذکرہ سے خاموش ہیں، خانوادۂ ولی اللہی پر قدیم یادداشت میں شاہ عبدالغنی کے مدفن کا ذکر ہے، مگر اس میں بھی تاریخ درج نہیں۔ تاریخ وفات ایشاں کے بعد بیاض چھوٹی ہوئی ہے، (120) اور مولانا جعفری نے بھی جو شاہ اسماعیل شہید کے رفیق سبق تھے، شاہ عبدالغنی کا سنہ وفات ذکر نہیں کیا، یہ کہہ کر گزر گئے کہ: ''وہ اپنی والدہ ماجدہ اور بھائیوں کی زندگی میں انتقال کر گئے تھے''۔ (121) تاریخ الآئمہ کی تالیف کے بعد ایک طویل عرصہ تک کسی مؤرخ و تذکرہ نگار نے ان کے سن وفات کا ذکر نہیں کیا، نہ ان کے لوحِ مزار پر سنہ وفات کندہ ہوا۔

مولوی شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری رجب ۱۳۱۱ھ/ جنوری 1894ء میں دہلی گئے تھے، اس وقت قبرستان مہندیاں میں خاندانِ شاہ ولی اللہ کے جن مزارات پر کتبات نصب تھے، ان میں شاہ عبدالغنی کا نام شامل نہیں، (122) مولوی داناپوری کے سفر کے ایک سال بعد رجب ۱۳۱۲ھ/ جنوری 1895ء میں مولانا عبدالحئ حسنی مؤلف نزہۃ الخواطر مہندیاں پہنچے، مولانا حسنی نے بھی ان بزرگوں کے مزارات پر تحریر (کتبہ) ہونے کی اطلاع دی ہے۔ (123) مگر اس فہرست میں بھی شاہ عبدالغنی کے لوحِ مزار کا ذکر نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک شاہ عبدالغنی کا سنہ وفات نامعلوم تھا، ورنہ ناممکن نہیں تھا، کہ دوسرے بزرگوں کے ساتھ ان کے مزار پر کتبہ نصب نہ کیا جاتا۔

شاہ عبدالغنی کے سنہ وفات کی روایات میں سب سے پہلی اطلاع سید احمد ولی اللہی کا یہ قول ہے کہ:

''۱۲۲۷ھ میں 57 برس کی عمر میں وفات پائی، اور شاہ عبدالقادر کے متصل مدفون ہوئے''۔ (124الف)

اکثر تذکرہ نگاروں نے اسی پر اعتماد کیا ہے، (124ب) مگر یہ روایت پایہ اعتبار سے ساقط اور خلافِ تحقیق

ہے کیوں کہ خود ولی اللّٰہی چند ہی سطر پہلے شاہ عبدالقادر کا سنہ وفات ۱۲۳۰ھ لکھ چکے ہیں۔ (125) لہٰذا یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ شاہ عبدالغنی، شاہ عبدالقادر کی وفات سے تین سال پیشتر ان کے متصل دفن کئے گئے ہوں، دستیاب شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کی وفات (۱۱۷۶ھ) کے بعد ان کے صاحبزادگان میں سے سب سے پہلے سب سے چھوٹے فرزند شاہ عبدالغنی کی رحلت ہوئی، دلائل وشواہد کی روشنی میں شاہ عبدالغنی کی صحیح تاریخ وفات میں اختلاف ہوسکتا ہے، مگر سید احمد ولی اللّٰہی کا مذکورہ بالا قول کہ: ''ان کی وفات ۱۲۲۷ھ میں ہوئی'' کسی طرح قابل قبول اور لائق اعتماد نہیں، کیوں کہ خانوادۂ ولی اللّٰہی کے قدیم وجدید تقریباً تمام تذکرہ نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ جس وقت شاہ عبدالغنی کی وفات ہوئی، تو ان کے بیٹے، شاہ محمد اسماعیل کم سن تھے، والد کی وفات کے بعد چچا یعنی حضرت شاہ عبدالقادر نے شاہ اسماعیل کی پرورش اور تعلیم وتربیت کی، اس سلسلہ کی غالباً سب سے پہلی اطلاع مولانا محبوب علی جعفری کا (جو شاہ اسماعیل کے بچپن سے ہم جولی اور ہم سبق تھے) یہ بیان ہے کہ:

**و (للشيخ عبدالغني) ابن اسمه اسماعيل و بنتين رقيه و ام كلثوم و وصى بهم اخاه عبدالقادر فرباهم كاولاده. (126)**

اگر شاہ عبدالغنی کی وفات ۱۲۲۷ھ میں ہوئی ہوتی تو اس وقت اس وصیت کی ضرورت تھی نہ موقع، کیوں کہ تذکرہ نگاروں کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ شاہ اسماعیل ۱۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے، (127) گویا ۱۲۲۷ھ میں ان کی عمر چونتیس سال تھی، اور وہ اس وقت درس وتدریس اور وعظ وتذکیر کے ذریعہ اپنی ذہانت وذکاوت، حسن تقریر اور خوش نوائی کا جادو جگائے ہوئے تھے، اور ان کی شہرت وقابلیت کا چرچا دور دور تک پھیل چکا تھا، لہٰذا معلوم ہوا کہ ولی اللّٰہی کی شاہ عبدالغنی کے سنہ وفات کے متعلق اطلاع کمزور اور بے اصل ہے۔ اور یہ روایت اس لیے بھی قرین صحت نہیں کہ مولانا جعفری نے جو شاہ صاحبان کی خدمت میں ہر وقت حاضر باش اور شاہ عبدالقادر کے خاص ارادت مند تھے، ۱۲۲۷ھ میں دہلی میں مقیم تھے، مولانا جعفری نے اس سال کے بعض وقائع کا ذکر کیا ہے اور ایک موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا اسماعیل شہید ۱۲۲۷ھ میں حضرت سید احمد شہید سے بیعت ہوئے، (128) اگر شاہ عبدالغنی کی وفات ۱۲۲۷ھ میں ہوئی ہوتی تو مولانا جعفری اس سے ہرگز ناواقف نہ ہوتے، اور اپنی کتاب میں اس کا ذکر ضرور کرتے، مولانا جعفری کے تذکرہ نہ کرنے سے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ شاہ عبدالغنی کی وفات کا واقعہ مولانا جعفری کی شاہ عبدالعزیز اور ان کے برادران کی خدمت میں حاضری سے بہت پہلے کا ہے، کم از کم اس وقت کا نہیں ہے جو سید احمد ولی اللّٰہی بیان کرتے ہیں۔

ولی اللّٰہی کے بیان کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ وہ ''یادگارِ دہلی'' کی تالیف کے زمانہ میں اپنی ایک اور کتاب ''احوال وکمالاتِ عزیزی'' میں یہ لکھ چکے تھے کہ شاہ عبدالغنی کا حال اچھی طرح معلوم نہیں، (129) اور ساتھ ہی یادگارِ دہلی میں تفصیلات بھی درج کر رہے ہیں۔ ایسا انداز ہے کہ اس اطلاع کے لیے خود ولی اللّٰہی کے پاس بھی کوئی

www.rahmania.org

قابل اعتماد بنیاد نہیں تھی، اور یہی وجہ ہے کہ حیاتِ ولی کے مؤلف رحیم بخش نے شاہ عبدالغنی کے تذکرہ میں یہ الفاظ لکھے:

''مجھے افسوس ہے کہ جناب شاہ عبدالغنی کے حالاتِ زندگی کسی ایسے وسیلے سے دستیاب نہیں ہوئے، جنہیں میں بے کم و کاست یقین کر سکتا، یہی وجہ ہے کہ میں ان واقعات کو بالکل قلم انداز کرتا ہوں''۔

حالانکہ مولوی رحیم بخش دہلی میں سید احمد ولی اللہی کے پڑوس میں رہتے تھے، وہ ولی اللہی اور ان کی تصنیفات سے ناواقف نہ ہوں گے، اس تعارف کے باوجود اس قسم کے الفاظ کا لکھنا بتا رہا ہے کہ مؤلف حیاتِ ولی کو اس سلسلہ میں ولی اللہی کے بیانات و روایات پر اعتماد نہیں تھا۔

شاہ عبدالغنی کے سنہ وفات کی ایک اور روایت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا یہ قول ہے کہ:

''شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہی 28 برس کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے''۔ (131)

یعنی تقریباً ۱۱۹۸ھ/ 1783,84ء میں ممکن ہے یہ روایت صحیح ہو مگر کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

شاہ صاحب کے سنہ وفات کی تیسری روایت جناب غلام رسول مہر (132) اور مولانا نسیم احمد فریدی (133) کا یہ انکشاف ہے کہ شاہ صاحب کی ۱۶ / رجب ۱۲۰۳ھ/ 12 اپریل 1789ء کو رحلت ہوئی، مہر صاحب کا ماخذ ہمیں معلوم نہیں، مگر مولانا فریدی نے یہ اطلاع ایک پرانی تحریر سے اخذ کی ہے، جو مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے نجی ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہے۔ تاہم یہ عنوان مزید تحقیق و جستجو کا منتظر ہے، مگر فیصلہ کن ماخذ کی دریافت تک اسی مؤخر الذکر روایت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

## ازدواج و نکاح

مولوی علاء الدین پھلتی کی دختر بی بی فضیلت شاہ عبدالغنی سے منسوب ہوئی، دو لڑکیاں رقیہ اور اُم کلثوم، اور ایک با اقبال و فخر روزگار فرزند حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید جسمانی یادگار تھے۔ شاہ محمد اسماعیل کا مولوی محمد مصطفیٰ کی دختر جمیلہ سے نکاح ہوا، جو شاہ عبدالقادر کی نواسی تھیں۔ ایک فرزند مولوی عمر تھے، جو ۱۲۶۸ھ میں لاولد فوت ہوئے۔

www.rahmia.org

# حوالہ جات اور توضیحات

1. شاہ ولی اللہ، مقدمہ مصفی شرح مؤطا، ص۱۷، ج۱، (بیروت: ۱۴۰۳ھ) نیز دیکھئے:الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، ص۲ (مطبع احمد دھلی: ۱۳۱۱ھ).

2۔ الامداد فی ماثر الاجداد ۔غالباً حضرت شاہ ولی اللہ کے سفرِ حج سے پہلے مرتب ہوئی۔انفاس العارفین میں شامل ہے،مگر اس رسالہ کو ایک تاریخی دستاویز کے بجائے خاندانی روایات و یادداشت کے طور پر دیکھنا چاہئے۔الامداد کے انفاس العارفین میں شامل اور علیحدہ بھی متعدد خطی نسخے دستیاب ہیں،کئی بار شائع ہو چکا ہے،صحیح ترین نسخہ مطبع احمدی دہلی کا وہ ایڈیشن ہے، جو شاہ ولی اللہ کے رسائل کے مجموعہ میں شامل ہے اور انفاس العارفین مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۳۳۵ھ کثیر الغلط ہے۔الامداد کے متعدد ترجمہ بھی ہوئے ہیں،راقم سطور کی معلومات میں ایوب قادری صاحب کا ترجمہ سب سے بہتر ہے،مگر تعجب ہے کہ قادری صاحب نے مجتبائی نسخہ کو اساس بنایا ہے۔راقم سطور نے الامداد کے متعدد نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔

3۔ الامداد فی ماثر الاجداد (مشمولہ رسائل خمسہ شاہ ولی اللہ) (احمدی دہلی: بلاسنہ)، نیز دیکھئے الامداد مشمولہ انفاس العارفین، ص ۱۵۲، (احمدی دہلی: بلاسنہ) خاندانِ ولی اللہی کا یہی نسب نامہ مرأۃ الانساب میں بھی شامل ہے،مگر اس میں کئی غلطیاں ہوگئی ہیں۔''ماہان'' کی جگہ''ہامان'' لکھا ہے۔''محمد شہریار بن عثمان'' کو''محمد بن شہریار بن عثمان'' دکھایا ہے، اس ترتیب سے ایک واسطہ زیادہ ہوگیا ہے۔اور''عمر حاکم ملک'' اور''فاروق'' کے درمیان''عادل ملک'' کا واسطہ ترک ہوا۔اس طرح یہ نسب نامہ مشکوک ہوگیا ہے۔دیکھئے مرأۃ الانساب، تالیف ضیاء الدین علوی،ص۳۸،۳۹، (جے پور:۱۳۳۵ھ)۔

4. الامداد فی ماثر الاجداد، مشمولہ انفاس العارفین، (مجتبائی دھلی: ۱۳۳۵ھ).

5. الامداد مشمولہ افاس العارفین، مکتوبہ سنہ ۱۲۳۹ھ، ص۱۲۲ (مخزونہ دار العلوم، دیوبند).

6۔ دیکھئے تاریخ الآئمہ فی ذکر خلفاء الامہ، مولانا سید محبوب علی جعفری دھلوی، نسخہ مؤلف مکتوبہ ومؤلفہ سنہ ۱۲۵۱ھ، (مخزونہ ہمدرد اسلامک انسٹیٹیوٹ، دہلی۔فوٹو اسٹیٹ کاپی مملوکہ راقم سطور) ص۵۸۹۔ص۶۰۷ صفحات کی یہ ترتیب ہمارے نسخہ کے مطابق ہے۔

7۔ جناب محمود احمد عباسی نے اس نسب نامہ کو جوں کا توں نقل کر دیا ہے۔تحقیق الانساب حاشیہ،ص۲۸۴، (دہلی:1952ء)۔

8۔ ابن حزم ظاہری، جمہرۃ انساب،ص۱۵۳ (بیروت:۱۴۰۳ھ)۔

9۔ مولانا جعفری کا بیان ہے کہ شاہ عبدالرحیم سے منسوب ایک خط میں بھی نسب نامہ کے آخری وسائط اسی طرح لکھے ہیں،جس طرح الامداد میں ہیں۔تاریخ الآئمہ فی ذکر خلفاء الامہ.

10. شاہ ولی اللہ، امداد مشمولہ رسائل خمسہ، ص۲.

11۔ شروانی،عبدالشاہد، باغی ہندوستان،ص۶۶، (لاہور: 1978ء) نیز دیکھئے:العلامہ فضل حق خیر آبادی حیاتہ و ماثرتہ مع تحقیق کتابہ الثورۃ الھندیۃ. ڈاکٹر قمر النساء،ص۳۳، (لاہور: 1986ء)،لیکن مولوی عبدالشاہد کی اکثر اطلاعات زبانی روایات پر مبنی ہیں، ان کی تاریخی استنادی حیثیت خاصی مشتبہ ہے۔ضرورت ہے کہ ان تمام روایات کا مفصل تنقیدی جائزہ لے کر

www.rahimia.org

خانوادہ خطیر الملک اور خاندان شیر ملک کے باہمی رشتوں کی تحقیق وجستجو کی جائے اور دونوں خاندانوں کے اسلاف کی خدمات اور تاریخ کو اور زیادہ واضح اور نمایاں کیا جائے، مگر افسوس کہ حضرت علامہ خیرآبادی اوران کے باکمال اہل خاندان پر اس وقت تک جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ سب عبدالشاہد خاں کی صدائے بازگشت اور ''باغی ہندوستان'' کی ناقص معلومات کی تکرار ہے۔ کاش اس خاندان میں ان کے شایانِ شان کچھ کام ہوا ہوتا۔

12۔ مولانا سید محبوب علی بن مصاحب علی جعفری دہلوی، ریواڑی (میوات) کے قدیم باشندے اور سادات کے اس قدیم خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس کا سلسلہ روابط میوات سے دہلی اور سونی پت تک پھیلا ہوا تھا۔ ۲۷ محرم سن ۱۲۰۱ھ کو تولد ہوئے (تاریخ الآئمہ، ص ۲۴۳ ) شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے تعلیم حاصل کی۔ شاہ محمد اسماعیل شہید کے رفیق و ہم سبق تھے۔ سلوک و معرفت میں شاہ عبدالقادر سے استفادہ کیا، شاہ عبدالعزیز سے اجازت وخلافت پائی، اولاً سید احمد شہید کے پُرجوش معاون تھے، جہاد میں شرکت کے لیے شعبان ۱۲۴۲ھ صوبہ سرحد کے لیے روانہ ہوئے، وہاں قیام کا کچھ زیادہ موقع نہیں ملا تھا کہ بعض مسائل پر سید احمد شہیدؒ سے اختلاف ہوا اور شروع سنہ ۱۲۴۳ھ میں دہلی واپس آگئے۔ اختلاف کی تفصیل کا موقع نہیں، مگر یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس کی بنیاد ذاتی وجوہات تھیں۔ مولانا جعفری کے خلافِ مزاج بعض واقعات کی وجہ سے اس میں تیزی آئی اور یہی واپسی کا سبب ہوئی، اگرچہ مولانا نے دہلی آکر جہاد کی برملا مخالفت کی، مگر شاہ اسماعیل شہید کی دعوتِ اصلاح وتجدید اور رد بدعات کے آخر وقت تک منادو مبلغ رہے، اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں، **تقویة الایمان** کا حاشیہ تصنیف کیا، مولانا شہید پر کئے گئے اعتراضات کے جواب دیئے اور تفسیر وفقہ کے موضوعات پر متعدد تصنیفات یادگار چھوڑیں۔

مولانا کا سب سے اہم مہتم بالشان کارنامہ **"تاریخ الآئمہ فی ذکر خلفاء الامہ"** کی تالیف وتدوین ہے، اس کتاب میں پہلی صدی ہجری سے مصنف کے زمانہ تک کے علماء، صلحاء اور سلاطین کے مختصر حالات قلمبند کئے گئے ہیں، خاندانِ شاہ ولی اللہ کے متعلق بعض نادر معلومات، اور انساب کے بعض مباحث اس کتاب کا خاص حصہ ہیں، یہ کتاب عربی میں نو سو بتیس صفحات پر مشتمل ہے، رمضان سنہ ۱۲۵۱ھ/ جنوری 1836ء میں اس کی تصنیف و کتابت مکمل ہوئی اور اس کا واحد معلوم نسخہ جو مؤلف کے قلم سے ہے، ہمدرد اسلامک انسٹیٹیوٹ نئی دہلی کے پچھلی شہر کلکشن میں محفوظ ہے اور اس کا مکمل فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں شامل ہے۔ مولانا جعفری کی ۱۰ ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۰ھ/ 17 مئی سنہ 1864ء کو دہلی میں وفات ہوئی۔ ''یادگارِ دہلی'' سید احمد ولی اللہی، ص ۹۲ اور **نزھة الخواطر**، مولانا سید عبدالحئی حسنی رائے بریلوی، ص ۴۰۶، ج ۷ (حیدرآباد: ۱۳۷۸ھ) میں مولانا کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔

13۔ میر محبوب علی جعفری دہلوی، تاریخ الآئمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص ۶۰۸۔ فاروقیان خیرآباد میں معروف اس روایت سے مولانا جعفری کی تائید ہوتی ہے کہ: ''خطیر الملک بلخی از بلخ بہ بدایوں تشریف آوردند'' (مستفاد از مکتوب مولانا نجم الحسن خیرآبادی، بنام راقم سطور، محررہ 18 دسمبر 1986ء)۔

14۔ شیخ شہاب الدین فرخ شاہ کابلی کے لیے جو فاروقیان ہند کے ایک وسیع اور لائق احترام سلسلہ کے جد اعلیٰ ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ کابل میں سریر آرائے حکومت تھے۔ مگر بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی: ''تاریخ اس فرخ شاہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی، لہٰذا اس کا مقام اور حیثیت ایک افسانہ بن کر رہ گیا ہے''، احوال و آثار شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر، ترجمہ قاضی محمد حفیظ اللہ، ص ۴۴، (لاہور: ۱۴۰۳ھ)۔

15. **تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الاُمہ، ص ۶۰۸.**

www.fahimia.org

16۔ آقائی عبدالحیؒ حبیبی، افغانستان بعد از اسلام، جلد اول (کابل: ۱۳۴۵ھ) آقائی حبیبی نے لکھا ہے: ''والی سیستان وخراسان و ہرات از دربار ہارون، درسنہ ۱۸۰ھ''، ص ۴۱۳، ج ۱۔ نیز کہتے ہیں: ''سکہ ہم دارد''، ص ۴۱۴۔

17۔ مثلاً: ابراہیم بن ہامان بن بہمن بن نسک (م سنہ ۱۸۸ھ) یعقوب سیرافی ابن ماہان۔ ابو محمد عبداللہ بن حامد بن محمد ماہان اجہانی (م سنہ ۳۸۹)، ابوالحسن محمد بن حسین بن محمد بن ماہیان (م ۳۴۴ھ)، نیز ابوجعفر عیسیٰ بن ماہان رازی (م ۱۶۰ھ) ان کا بیٹا علی (م سنہ ۱۹۵ھ) اور پوتا حسین (م ۱۹۶ھ) سب ابن ماہان کی کنیت سے متعارف ہیں، ان کے علاوہ بھی متعدد مشاہیر اسی کنیت سے مشہور ہیں۔

18. هـذا النسبة الى مـاهـان وهـم اسـم لبـعـض اجداد المنتسب اليه وهم جماعة، الانساب، سمعانى، ص ۱ ۶ ، ج ۲ ۱ ، (حيدر آباد: ۱ ۴ ۰ ۱ ھ).

19. الامداد فی ماثر الاجداد (مشمولة رسائل خمسة) ص ۲ .

20۔ اُمراء کے طبقوں میں خان کا مرتبہ سب سے زیادہ، اس سے کم ملک، اور اس سے کم امیر کا سمجھا جاتا تھا۔ صاحب مسالک البصار کی تحقیق کے مطابق خان کو زیادہ سے زیادہ نو جھنڈے اور امیر کو کم از کم تین جھنڈے ساتھ رکھنے کا حق تھا، فوج کی تقسیم میں امیر کے تحت سو سوار ہوتے تھے، ملک کے تحت ایک ہزار اور خان کے تحت دس ہزار، تاریخ فیروز شاہی برنی، اردو ترجمہ ڈاکٹر معین الحق، حاشیہ، ص ۲۷ وص ۱۱۲ (لاہور: 1983ء)۔

21. الامداد ، ص ۲ .

22۔ مولوی رضی الدین بسمل بدایونی، کنز التاریخ (تاریخ بدایوان) ص ۵۳۔ مگر مولوی رضی الدین نے اولیائے بدایوں پر اپنی کتاب ''تذکرۃ الواصلین'' (بدایوں: 1945ء) میں شیخ حسام الدین کا قطعاً کوئی ذکر نہیں کیا۔

23۔ اگرچہ ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں بدایوں میں حسام الدین نامی دو اور شخصوں کا ذکر ملتا ہے: شیخ جمال حسام الدین ملتانی، متوفی سن ۶۸۷ھ/ 1288ء، سیر العارفین شیخ جمال، ترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری، ص ۱۹۴ (لاہور: 1976ء) اور ضیاء الدین برنی کے نانا حسام الدین جو بدایوں میں مقیم رہے، اور برنی (ولادت تقریباً ۶۸۴ھ) کے سن شعور تک حیات رہے، برنی ان کے حوالہ سے بعض روایات نقل کرتا ہے، مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر کا عہد ان لوگوں سے پہلے کا ہے، اس لیے کم سے کم یہ دونوں اس مسجد کے بانی نہیں ہوسکتے۔

24۔ محمد قاسم، ہندوشاہ، فرشتہ، تاریخ فرشتہ، اردو ترجمہ، ص ۹۷، ج ۱، (نولکشور، لکھنو: 1933ء)۔

25۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخی مقالات، ص ۴۰، ۴۱، (دہلی: ۱۳۸۵ھ)۔

26. الامداد فی ماثر الاجداد، ص ۲ .

27۔ پروفیسر منظور الحق صدیقی، ہادی ہریانہ (احوال وسوانح شاہ محمد رمضان مہمی)، ص ۱، (لاہور: 1963ء)۔

28. الامداد، ص ۲ .

29۔ یہ یادداشت خانوادۂ ولی اللہی کے متعلق قیمتی معلومات پر مشتمل ہے اور سنہ ۱۲۳۰ھ۔ ۱۲۳۳ھ کے درمیان کسی وقت مرتب ہوئی۔ اگرچہ اس کے مرتب کا نام معلوم نہیں، مگر وہ اس خاندان سے وابستہ یا اس کے قریب ترین واقفین میں سے ہے۔ اس یادداشت کے دو نسخے راقم سطور کی نظر سے گزرے ہیں۔ ایک کتب خانہ مظاہر علوم سہارن پور میں اور ایک ہمدرد انسٹیٹیوٹ لائبریری، دہلی میں۔ اول الذکر نسخہ مجموعہ فتاویٰ وتحریرات حضرت شاہ عبدالعزیز وغیرہ اخلاف شاہ ولی اللہ، مرتبہ کریم اللہ بن خلیل اللہ ڈار، مؤلفہ

www.rahimia.org

سنہ ۱۲۴۰ھ میں شامل ہے۔ زیر تعارف نسخہ فلسکیپ سائز کے پانچ سوصفحات پر مشتمل ہے اور میرا خیال ہے کہ خود مؤلف کے قلم سے ہے۔ اس کتاب کے بعض مشتملات کا فوٹو اسٹیٹ، جس میں مذکورہ یادداشت بھی شامل ہے، ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ نسخہ ثانی مجموعہ فتاویٰ شاہ عبدالعزیز، مکتوبہ مولانا محمد مچھلی شہری (م سنہ ۱۳۲۰ھ) میں شامل ہے۔ ورق ۴۷، ۴۸، زیر نظر صفحات میں اول الذکر نسخہ سے استفادہ ہوا ہے اور صفحات کی ترتیب مخطوطہ کے صفحات کی مسلسل ترتیب کے مطابق ہے۔

30. تاریخ الائمه فی ذکر خلفاء الامه، ص ۵۸۹.

31۔ واقعاتِ دارالحکومت دہلی، مولوی بشیر الدین احمد، ص ۳۲۳، ج ۳، (آگرہ: ۱۳۳۷ھ) مولوی بشیر الدین احمد نے جلال تبریزی نامی جس بزرگ کا ذکر کیا ہے، وہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ شیخ جلال تبریزی کے علاوہ کوئی گمنام بزرگ تھے، مؤخر الذکر اگر چہ دہلی اور بدایوں میں قیام فرما رہے، مگر ان کے وفات ''کامروپ'' (آسام) میں ہوئی۔ ابن بطوطہ اپنے سفر کے دوران کامروپ میں ان سے ملا تھا، سفر نامہ ابن بطوطہ مع حواشی وتعلیقات خان بہادر محمد حسین، ص ۳۸۳، ص ۳۸۶، (اسلام آباد: 1983ء)۔

32۔ احمد علی خیر آبادی کا قول ہے کہ اس جگہ ایک قبر مولانا علاء الدین کرمانی سرسوی کی ہے۔ قصر عارفاں، مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر، ۳۸۶، اورینٹل کالج میگزین، لاہور 1965,66۔

33۔ محمد ادریس خاں بریلوی، مہرولی گائیڈ، ص ۲۵۵، (بریلی: بلاسنہ)۔

34۔ ہادی ہریانہ، پروفیسر منظور الحق صدیقی، ص ۱۹، ص ۲۰، (لاہور: 1963ء)، صدیقی صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کا خاندان آخری دور میں رہتک میں بھوائی بس اڈہ کے پاس گلی مسجد عاشق الٰہی میں رہا کرتا تھا۔

35. تاریخ الائمه فی ذکر خلفاء الامه، ص ۵۸۸.

36. الامداد فی ماثر الاجداد، ص ۲، ۳.

37. تاریخ الائمه فی ذکر خلفاء الامه، ص ۵۸۹.

38۔ ترجمہ الامداد فی ماثر الاجداد بحواشی و توضیحات، پروفیسر محمد ایوب قادری، ماہنامہ الرحیم، حیدر آباد، سندھ، ص ۱۵، (جون: 1967ء) بحوالہ مرقات الیقین فی حیات نورالدین اکبر شاہ نجیب آبادی، ص ۸۰۔

39. الجزء اللطیف مشمولة الانفاس العارفین، ص ۲۰۲، (مجتبائی: ۱۳۳۵ھ)

40۔ شاہ عبدالرحمٰن خلف شاہ محمد عاشق پھلتی، مرتبہ مجموعہ مکتوبات شاہ ولی اللہ، مکتوب نمبر 167، مخزونہ کتب خانہ دارالعلوم، دیوبند، (فوٹو اسٹیٹ کاپی مملوکہ راقم سطور)، یہ مجموعہ مکتوبات دو جلدوں میں ہے، جلد اول شاہ عبدالرحمٰن کی مرتبہ و مؤلفہ ہے، جلد دوم شاہ محمد عاشق کی تالیف ہے، جلد اول دوسو اکیاسی (281) مکتوبات پر مشتمل ہے، دوسری جلد میں ستتر (77) خطوط آئے ہیں۔

41۔ حکیم محمود احمد صاحب برکاتی نے لکھا ہے: ''شیخ عبید اللہ کی ایک صاحبزادی فاطمہ اور ایک صاحبزادہ شاہ محمد عاشق تھے، فاطمہ سے شاہ ولی اللہ کی شادی ہوئی اور ان سے صرف ایک صاحبزادہ شیخ محمد پیدا ہوا''، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص ۲۰، (لاہور: 1976ء) مگر یہ اطلاع درست نہیں، صحیح یہ ہے کہ شاہ صاحب کی زوجہ اولیٰ کا نام امت الرحیم، اور ایک صاحبزادی کا نام فاطمہ تھا، منشی فرحت اللہ پھلتی نے بھی یہی لکھا ہے اور اہل پھلت کے قلمی نسب ناموں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور اس کی جزوی تصدیق خود شاہ صاحب کے مکتوبات سے ہورہی ہے۔

42۔ یہ خاندان ساداتِ حسینی کی ایک شاخ اور سید ناصرالدین سونی پتی کی اولاد میں ہے، مگر خود سید ناصرالدین کا عہد اور ان کے

حضرت حسین کے درمیان وسائط معلوم نہیں، احمد علی خیر آبادی نے سید ناصر الدین کے متعلق ایک طویل داستان لکھی ہے اور ان کو حضرت باقر بن زین العابدین کا بلاواسطہ فرزند قرار دیا ہے اور ان کا سنہ وفات سنہ ۱۴۶ھ لکھا ہے۔ (قصر عارفاں، ص۲۷۹، ص۲۹۲) نیز دیکھئے میخانہ درد، سید ناصر نذیر فراق دہلوی، ص۲۱۴ تا ۲۲۵، (دہلی: ۱۳۴۴ھ) مگر خیر آبادی کی یہ روایت مسلمہ تاریخی شہادتوں اور اہل سیر کی تصریحات کے خلاف ہے۔ ملاحظہ ہو: تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص۱۰۶، ص۱۰۷، (لکھنؤ: ۱۴۰۴ھ)۔

43۔ خاندان شیر ملک اور سادات سونی پت نکاح و ازدواج کے سلسلہ سے مربوط تھے، ان کی ابتداء کب ہوئی، صحیح معلوم نہیں، مگر دسویں صدی ہجری میں شیخ احمد بن محمود کا شاہ عبدالغنی سونی پتی کی دختر سے نکاح ہوا اور اس کے بعد خاندانِ ولی اللہی کے آخری معلوم عہد تک دونوں خاندانوں میں قرابت اور ازدواج و نکاح کے روابط تھے۔

44۔ (الف) شاہ صاحب نے تفہیماتِ الٰہیہ میں شاہ نوراللہ کو ایک ضرورت سے سونی پت بھیجنے کا ذکر کیا ہے، ص۱۵۲، ج۲، (بجنور: ۱۳۵۵ھ) ممکن ہے اس معاملہ سے اسی رشتہ کی سلسلہ جنبائی مراد ہو۔

44۔ (ب) عبدالرحیم ضیاء نے مقالات طریقت میں (مضمون جناب عضد الدین خان، الفرقان، لکھنؤ، ص۱۶، رجب 1985ء) اور مولانا عبدالحئ حسنی نے سید احمد ولی اللہی کے حوالہ سے بی بی ارادت کے والد ماجد کا نام سید ثناء اللہ لکھا ہے، (''دہلی اور اس کے اطراف''، ص۶۸، دہلی: 1958ء) مگر یہ روایات صحیح نہیں۔ خانوادہ ولی اللہی پر قدیم یادداشت میں شاہ صاحب کی زوجہ ثانیہ کو دختر سید حامد لکھا ہے اور سید احمد ولی اللہی نے بھی بقول حکیم محمود احمد صاحب برکاتی (شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص۱۴۹) یہی لکھا ہے۔

45۔ شاہ ولی اللہ نے شاہ عبدالرحیم کے حوالہ سے شرح جامی کی ایک بحث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''وبشیخ حامد تقریر کردم''، انفاس العارفین، ص۳۰، (مجتبائی)۔

46۔ شاہ فخر العالم صاحب علم وارشاد بزرگ تھے، انہوں نے اپنے والد ماجد کے مکتوبات کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ نے ''شوارق المعرفۃ'' میں شاہ ابوالرضا محمد کے جو مکتوبات نقل کئے ہیں، وہ اسی مجموعہ سے ماخوذ ہیں، اس مجموعہ مکتوبات کا واحد معلوم نسخہ شاہ محمد عاشق کے موئے قلم کی یادگار ہے اور اس کا فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

47۔ حکیم محمود احمد برکاتی، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص۱۲۶، ص۱۴۶۔

48۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز، ص۱۰۹، (میرٹھ: ۱۳۱۴ھ) سید احمد ولی اللہی نے ملفوظات شاہ عبدالعزیز اور خانوادہ ولی اللہی سے منسوب بعض تصنیفات کو جعلی قرار دیا ہے۔ (دیکھئے: انفاس العارفین، مطبع احمدی، دہلی)، گزشتہ چند سال سے ولی اللہی کے اس بیان کی خاص شہرت ہوئی، بعض اہل قلم نے اس استشہادی تحریر کو غیر معمولی اہمیت سے نوازا، اور اس کے حوالہ سے عجیب و غریب انکشافات کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ولی اللہی کی یہ تحریر صرف معاصرانہ رقابت اور تجارتی چشمک پر مبنی ہے اور اس کی کوئی حقیقی علمی بنیاد موجود نہیں۔ تفصیلات ایک مستقل مقالہ کی متقاضی ہیں۔ زیر نظر سطور اس کا محل نہیں۔

49۔ مضمون، مولانا نسیم احمد صاحب فریدی، الفرقان، لکھنؤ:

50۔ عبدالرحمٰن، مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ، مکتوب نمبر 167۔

51. تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص۷۴۷.

52۔ مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ، مکتوب 167۔

53۔ مکتوب بنام راقم سطور، محررہ ۷رصفر، سنہ ۱۴۰۷ھ، بحوالہ القول الجلی، "القولی الجلی فی مناقب الولی" کا مکمل نسخہ مکتوبہ ۱۲۲۹ھ، خانقاہ کاظمیہ قلندریہ میں موجود ہے، اس نسخہ کے تعارف کے لیے دیکھئے مضمون: جناب ندیم حیدر کاکوروی، ماہنامہ قاری، دہلی، فروری: 1986ء، اور ایک ناقص نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں ہے۔ مفصل تعارف کے لیے مطالعہ کریں مضمون: جناب فضیل احمد قادری، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، (شوال ۱۴۰۷ھ/ جون 1987ء)۔

54۔ تذکرۃ الرشید، (سوانح حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی) حاشیہ، ص۳۰، ج۱، (سہارنپور: 1977ء)۔

55۔ مضمون جناب عضدالدین خان، الفرقان، لکھنؤ، ص۱۶، (رجب ۱۳۸۵ھ)۔

56۔ مکتوب شاہ ولی اللہ بنام شاہ محمد عاشق، بیاض مولانا رشید الدین دہلوی، ورق ۹ ب، (مخزونہ دارالعلوم، دیوبند، فوٹو اسٹیٹ کاپی مملوکہ راقم سطور) نیز دیکھئے: حیاتِ ولی، مولوی رحیم بخش دہلوی، ص۲۹۰، (دہلی: ۱۳۱۹ھ)۔

57۔ غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص۱۱۵، ج۱، (لاہور طبع اول بلاسنہ) نیز سیرت حضرت سید احمد شہید، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص۱۵۲، ج۱، (لکھنؤ: ۱۳۹۷ھ)۔

58۔ شاہ محمد عاشق، مکتوبات شاہ ولی اللہ، حصہ دوم، مکتوب نمبر 12، ورق نمبر ۶، (نسخہ مؤلف، مخزونہ دارالعلوم، دیوبند، فوٹو اسٹیٹ کاپی مملوکہ راقم سطور)۔

59۔ یادداشت، مشمولہ مجموعہ تحریرات وفتاویٰ خانوادۂ ولی اللہی، ص۴۷۲۔

60. تاریخ الائمه فی ذکر خلفاء الامه، ص ۱۵۵، ص ۱۵۹.

61۔ مکتوب بنام شاہ محمد فایق، بیاض مولانا رشیدالدین دہلوی، ورق ۱۳، الف۔

62۔ اس رسالہ کا شاہ صاحب کے تذکرہ نگاروں نے ذکر نہیں کیا، اس کا ایک نسخہ حبیب گلکشن مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، اور ایک ناقص نسخہ شاہ محمد عاشق کے نقل کردہ مجموعہ میں شامل ہے، مؤخر الذکر کا فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرۂ کتب میں شامل ہے۔

63. عبدالحئی حسنی، نزهة الخواطر، ص۲۶۷، ج۷.

64. عجاله نافعه، ص ۲۴، (مطبع مصطفائی، لکھنؤ: ۱۲۵۵ه) نسخه ذاتی.

65۔ مکتوب مولانا مجتبیٰ حیدر کاکوروی، بنام راقم سطور، بحوالہ القول الجلی۔

66. دیکھئے: مکتوب شاہ ابوسعید بنام برادرانِ خمسه شاہ عبدالعزیز، و مکتوب شاہ عبدالعزیز بنام شاہ ابوسعید رائے بریلوی زیر عنوان "شاہ ابوسعید حسنی کے روابط شاہ ولی الله اور ان کے خاندان سے"، مرتبه مولانا نسیم احمد فریدی، (ماهنامه الفرقان، لکھنؤ، صفر ۱۳۸۵ه).

67۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص۱۴۸۔

68۔ سید عبدالحئی حسنی، دہلی اور اس کے اطراف، ص۶۸۔

69۔ خانوادۂ ولی اللہی کی زیریں شاخیں اور ان کے نسبی سلسلے، ماہنامہ برہان، دہلی، ص۳۰، (جنوری 1982ء)۔

70۔ نزہۃ الخواطر، ص۴۲۲، ج۷۔

71۔ بڈھانہ، ضلع مظفر نگر (یوپی) کی وسیع اور کشادہ مسجد سن ۱۱۰۸ھ میں تعمیر ہوئی، مقامی روایات کے مطابق شاہ نوراللہ اور ان کے اہل خاندان اس کے اطراف میں آباد تھے، مگر اب وہاں اس خاندان کا کوئی فرد باقی نہیں۔

72۔ مضمون جناب عضدالدین خاں، (الفرقان: رجب ۱۳۸۵ھ)۔

www.rahmia.org

73۔ خانوادۂ ولی اللٰہی کی زیریں شاخیں اور ان کے نسبی سلسلے، برہان، دہلی، ص۳۰۔
74۔ عاشق الٰہی، میرٹھی، تذکرۃ الرشید، ص۳۰، ج۱۔
75۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز، ص۱۰۹۔
76. ملفوظات شاہ عبدالعزیز: تاریخ تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص۷۴۷، شاہ صاحب نے تحفہ اثنا عشریہ کے کلمہ افتتاح میں یہی نام استعمال فرمایا ہے.
77۔ رسالہ صرف، فارسی منظوم، مخزونہ کتب خانہ مظاہر علوم، سہارنپور، اس نسخہ پر کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں، مگر اس سے ملحق بعض رسائل وتحریرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا کاتب شاہ محمد اسحاق کا شاگرد ہے۔
78. تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص۷۴۷۔ نیز دیکھئے خاتمہ الطبع تفسیر عزیزی، پارہ تبارک ۲۹، ص ۲۵۹، (کلکتہ ۱۲۴۸ھ).
79۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، مؤمن: شخصیت اور فن، ص۳۱۷، ۳۱۸، (دہلی: 1972ء)۔
80۔ بیاض مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی (متوفی سنہ ۱۲۶۹ھ-۱۸۵۳ھ)، ورق ۱۳۴، الف۔ یہ قطعۂ تاریخ سب سے پہلے غالباً آثار الصنادید میں درج ہوا، اور اس کے حوالہ سے متاخر تذکروں میں نقل ہوتا رہا، مگر کسی بھی تذکرہ نگار نے مولانا ابوالحسن کا نام نہیں لکھا۔ مولوی ابویحییٰ امام خاں سے اس کی نقل میں ایک دلچسپ غلطی ہوئی ہے، دیکھئے تراجم علمائے اہل حدیث ہند، ص۸۵، (لاہور: ۱۳۹۱ھ)۔
81۔ اوراق خودنوشت رنگین، مملوکہ راقم سطور، نیز یہ فقراتِ تاریخ، مجموعہ رنگین میں بھی شامل ہیں۔ دیکھئے: سعادت یار خاں رنگین، ڈاکٹر صابر علی خان، ص۴۳۴، ص۴۳۵، (کراچی: 1956ء)
82۔ یہ کتبات مولوی ممتاز علی میرٹھی نے نصب کرائے تھے اور رجب سنہ ۱۳۱۱ھ میں مزارات پر موجود تھے، سیر دہلی، ص۷۳، از مولوی محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری، (آگرہ: ۱۳۱۱ھ)، مگر یہ سید احمد ولی اللٰہی کا قول ہے کہ: ''یہ تمام قبرستان نزول میں آگیا تھا، میں نے سنہ ۱۳۱۳ھ میں اس کی مرمت اور حد بندی کرائی''، یادگارِ دہلی، ص۱۰۵۔
83۔ سرسید احمد خان، آثار الصنادید، باب چہارم، ص۴۱، (لکھنؤ: 1900ء)۔
84۔ رحیم بخش دہلوی، حیات ولی، سنہ 1901ء، ص۳۴۲، (دہلی: ۱۳۱۹ھ)۔
85۔ رحیم بخش دہلوی، حیات عزیزی، مؤلفہ سنہ 1899ء، ص۶۳، ۶۴، (دہلی، طبع اول بلاسنہ) نیز دیکھئے: مجموعہ احوال وکمالاتِ عزیزی، سید احمد ولی اللٰہی، ص۴۰، (کراچی: 1973ء)۔
86۔ چند اور فقرات و قطعات تواریخ کے لیے دیکھئے: گنج تواریخ، عبدالغفور نساخ، ص۲۷، (لکھنؤ: ۱۲۹۰ھ)، ریاض النور، مولوی نصیرالدین سلہٹی، ص۳۲، (کانپور، ۱۲۹۹ھ)۔
87. تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص۷۴۷.
88۔ شاہ محمد عاشق، مکتوبات شاہ ولی اللہ، مکتوب نمبر 16۔
89۔ ماہنامہ برہان، دہلی، ص۳۳، (جنوری 1983ء)۔
90۔ سید احمد ولی اللٰہی، مجموعہ احوال و کمالاتِ عزیزی، ص۴۱۔
91۔ بیاض مولانا رشیدالدین دہلوی، ورق ۲۹، الف۔ اس کا ایک اقتباس مولانا نسیم احمد فریدی کے مضمون ''سراج الہند حضرت شاہ

www.rahimia.org

عبدالعزیز'' میں شامل ہے۔ الفرقان، لکھنؤ، ص۵۰، (صفر ۱۳۸۸ھ)۔

92۔ یہ منشی فرحت اللہ پھلتی اور اہل پھلت کے نسب ناموں کے مطابق ہے، مگر سید احمد ولی اللہی نے زوجہ مولوی محمد عیسیٰ کو دختر اول، اور زوجہ محمد افضل کو دختر دوم لکھا ہے۔ مجموعہ احوال و کمالات عزیزی، ص ۴۱۔

93۔ ماہنامہ برہان، ص۳۳، (جنوری: 1982ء)، زیر عنوان: ''خانوادۂ ولی اللہ کی زریں شاخیں اور ان کے نسبی سلسلے''، مرتبہ نور الحسن ارشد کاندھلوی، یہ مضمون خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کی شاخ در شاخ تفصیلات پر مبنی ایک یادداشت ہے، جو منشی فرحت اللہ بن سلیم اللہ پھلتی نے مولانا شاہ عبدالقیوم بڑھانوی کی ایماء پر سنہ ۱۲۸۳ھ میں مرتب کی، مولانا عبدالقیوم نے اس کو دیکھا اور اس کی تحسین فرمائی۔ پھلت (ضلع مظفر نگر) میں اس کے متعدد خطی نسخے موجود ہیں۔ راقم سطور نے اس کو دو نسخوں کی مدد سے مرتب کیا، جو ماہنامہ برہان، دہلی کی جنوری، فروری 1982ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ فرحت اللہ پھلتی کا اس تحریر میں بار بار ذکر آئے گا، اس سے یہی یادداشت اور مضمون مراد ہوگا۔

94۔ بیاض مولانا ابوالحسن کاندھلوی، ورق ۱۳۳ الف۔

95۔ شاہ عبدالرحمٰن، مکتوبات شاہ ولی اللہ، مکتوب نمبر 172۔

96۔ مضمون مولون نسیم احمد فریدی، الفرقان، لکھنؤ، ص۲۵، ۲۶، (ربیع الاول ۱۳۳۸ھ)، اس خط کے مکمل متن کے لیے ملاحظہ فرمایئے بیاض مولانا رشید الدین دہلوی، ورق ۴۰ الف۔

97۔ مکتوب بنام شاہ ابوسعید رائے بریلوی، ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، (صفر: 1985ء) جناب حکیم محمود احمد برکاتی نے اس خط کا ایک اقتباس نقل کرنے کے بعد اس کا سنہ کتابت ۱۱۷۹ھ لکھا ہے، اور ''مکتوب المعارف'' کا حوالہ دیا ہے، مگر یہ دونوں اطلاعیں صحیح نہیں، اس خط میں سن تحریر درج نہیں اور ایسا کوئی قرینہ بھی نہیں، جس کی بنا پر اس کا سنہ کتابت متعین کیا جاسکے، نیز اس خط کا مکتوب المعارف سے کوئی تعلق نہیں۔ ''مکتوب المعارف'' شاہ ولی اللہ اور شاہ ابوسعید رائے بریلوی کے مراسلات کا ایک مختصر سا مجموعہ، جس کو مولانا ابوالقاسم ہنسوی نے مرتب کیا اور وہ سنہ ۱۳۰۴ھ میں مطبع الانوار سہارنپور سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں شاہ عبدالعزیز کا کوئی خط شامل نہیں۔ شاہ صاحب کا محولہ بالا خط حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ذاتی ذخیرہ نوادرات کی زینت ہے۔

98. تاریخ الائمه فی ذکر خلفاء الامه، ص۷۴۷، ص۸۸۸.

99۔ فہرست اردو مخطوطات، رضا لائبریری، رام پور، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ص۲، (رام پور: 1967ء) بحوالہ دیوان عنبر، قلمی مخزونہ رضا لائبریری۔

100۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز، ص۸۳، ص۸۴، ص۹۲۔

101۔ مولوی فقیر محمد جہلمی، حدائق الحنفیه مع حواشی و تکمله، خورشید احمد خاں، ص۴۸۷، (لاہور: طبع الاول بلاسنہ)، جہلمی نے فقرۂ تاریخ ''چشمۂ فیض'' صحیح نقل کیا ہے، مگر سن غلط لکھا ہے۔ نیز دیکھئے: تاریخ اولیائے صوبہ دہلی، رکن الدین نظامی، ص۲۰۱، (دہلی: ۱۳۵۴ھ)۔

102۔ تراجم علمائے اہل حدیث ہند، ص۸۸، نیز ملاحظہ ہو: ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات، ابویحییٰ امام خاں، ص۳۳، یادگارِ دہلی میں سہو کتابت کے سن ۱۲۳۳ھ کا سنہ ۱۷۳۳ھ ہوگیا، ص۱۰۳۔

103۔ ماہنامہ برہان، دہلی، ص۳۱، (جنوری: 1982ء)۔

104۔ دہلی میں مطبع احمد کے نام سے متعدد پریس قائم ہوئے، جن میں مولانا احمد علی محدث سہار نپوری اور اموجان کے مطابع کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ بعض مطابع کے تعارف کے لیے دیکھئے راقم سطور کا مضمون ''باقیات آزردہ'' مجلّہ غالب نامہ، نئی دہلی، جنوری 1983ء، حاشیہ ص۲۱۰، ص۲۱۱، مگر ولی اللہ کا مطبع ان مطابع میں شامل نہیں، وہ نسبتاً چھوٹا اور متاخر مطبع تھا، جو سید احمد ولی اللہی کی حیات میں ختم ہوگیا ہے، تاہم اس مطبع نے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان کی کتابوں کی نشر و اشاعت میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ زیرِ نظر سطور میں مطبع احمدی سے اسی مطبع کی مطبوعات کی جانب اشارہ ہوا ہے۔

105۔ ان معلومات کے لیے مولوی حکیم اختر الحق بن عبدالحئ خلف منشی فرحت اللہ پھلتی کا شکریہ واجب ہے، موصوف اسی خانوادہ کے ایک فرد ہیں، ان کی دادی صاحبہ منشی فرحت اللہ کی اہلیہ مولوی محمد حسن کی دختر تھیں، اس لیے ان معلومات کی بے حد اہمیت ہے اور اس میں شک وشبہ کا امکان کم سے کم ہے۔

106۔ یادگارِ دہلی، ص۱۰۴۔

107. تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص ۱۰۳ ، یادگارِ دہلی، ص۱۰۳، نیز میخانہ درد، ص۱۶۳، ۱۶۴۔

108۔ شاہ ابوالعدل یا عبدالعدل قرشی دہلوی، حضرت خواجہ محمد زبیر مجددی کے خلیفہ اعظم اور جانشین تھے، ولادت سنہ ۱۱۲۰ھ، وفات ۱۲۰۴ھ، ''چراغ'' سے سن وفات معلوم ہوتا ہے۔ خانقاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔ راقم سطور کی حقیر معلومات میں مولانا جعفری واحد تذکرہ نگار ہیں، جو ان کے سنین ولادت و وفات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ (تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص۷۵۴)، مزید معلومات کے لیے دیکھئے باب پنجم نور القلوب احوال و ملفوظات میاں شاہ آبادانی سیالکوٹی، تالیف امجد علی رضوی، مؤلفہ سنہ ۱۲۲۶ھ، نور القلوب کا ایک نہایت عمدہ خوش قلم نسخہ مکتوبہ سنہ ۱۲۸۱ھ پروفیسر نثار احمد فاروقی، صدر شعبہ عربی، دلی یونیورسٹی، دہلی کے ذاتی ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے، اس نسخہ کے استفادہ کے لیے فاروقی صاحب کا ممنون ہوں۔

109۔ مولانا جعفری نے شاہ عبدالقادر کو شاہ ابوالعدل کا خلیفہ اعظم (جانشین) لکھا ہے۔ (تاریخ الائمہ، ص۷۵۲) مگر اکبر شاہ ثانی کا برا بھائی شہزادہ منعم بخت، اپنے پیرومرشد مولانا کمال الدین کاندھلوی (برادر خورد مفتی الٰہی بخش) کو ''سجادہ نشین حضرت شاہ محمد عبدالعدل'' کہتا ہے۔ ملاحظہ ہو انوار القلوب (جو مغلیہ عہد خصوصاً شاہ عالم کے دور کے مفصل تاریخ ہے) مؤلفہ سنہ ۱۲۵۵ھ، مکتوبہ بعہد بہادر شاہ ظفر، یہ ہمارے خاندانی کتب خانہ کا مخطوطہ ہے اور اس وقت دار العلوم، دیوبند میں محفوظ ہے۔

110۔ یادداشت ملحق و مجلد مع تحریرات وفتاویٰ خانوادہ شاہ ولی اللہ، ورق ۱۱۱۔

111۔ تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص۷۵۹، اگرچہ مولانا جعفری نے ایک موقع پر شاہ صاحب کی تاریخ وفات ۱۴/رجب بھی لکھی ہے (ص۷۴۷)، مگر قدیم یادداشت اور خود مولانا جعفری کی تصریحات کی رو سے اول الذکر کو ترجیح حاصل ہے۔

112۔ غلام رسول مہر، سید احمد شہیدؒ، ص۱۱۶، ج۱۔

113۔ غلام سرور لاہور، خزینۃ الاصفیاء، ص۳۸۹، ج۲، (مطبع ہند، لکھنؤ: ۱۲۹۰ھ)، وحدیقۃ الاولیاء، ص۱۱۷، (نولکشور، کانپور، ۱۲۹۴ھ) حدیقۃ الاولیاء تحقیق و تعلیق جناب محمد اقبال مجددی، ص۲۱۵، (لاہور: ۱۳۹۶ھ) نیز دیکھئے: تراجم علمائے اہل حدیث، ص۸۷، شاہ عبدالقادر کے مزار پر ایک عرصہ تک یہی سن وفات ۱۲۴۲ھ کندہ تھا۔

114۔ ابو یحییٰ امام، ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات، ص۳۳، (چیچہ وطنی، ساہیوال: ۱۳۹۱ھ)۔

115۔ مولوی مصطفیٰ خانوادۂ ولی اللہی کے پہلے اور غالباً واحد شخص ہیں، جن کا شعراء کے تذکروں میں ذکر آیا ہے۔ مولوی مصطفیٰ اگرچہ علمی کمالات میں خاندانی روایات کے جامع نہیں تھے، مگر تذکرہ نگاروں نے ان کے اخلاق اور خاندانی روایات کی حتی الامکان

www.rahmia.org

پاسداری برتنے کی تعریف کی ہے، شعر و سخن میں ثناء اللہ فراق سے تلمذ تھا، مزید معلومات کے لیے دیکھئے: نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، گلشن بے خار، ترجمہ احسان الحق فاروقی، ص۱۳۷، (کراچی: 1962ء)، مولوی کریم الدین پانی پتی، طبقات شعرائے ہند، ص۳۶۹، (دہلی: 1847ء)، گلشن ہمیشہ بہار، مولانا نصر اللہ خاں خویشگی، ص۲۲، (مطبع فتح الاخبار کول، علی گڑھ: ۱۲۷۰ھ)، گلشن ہمیشہ بہار، ڈاکٹر محمد اسلم فرخی، ص۹۴، (کراچی: 1967ء)، گلستان بے خزاں، قادر بخش صابر، مرتبہ جناب خلیل الرحمٰن داؤدی، ص۳۳۳، ج۱، (لاہور: 1966ء)، لالہ سری رام، خمخانہ جاوید، ص۴۸، ج۲، (دہلی: 1911ء)، بعض اور تذکرہ نگاروں نے بھی تحیر کا ذکر کیا ہے۔

116۔ تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص۷۴۷، نیز فرحت اللہ پھلتی، برہان، دہلی، ص۳۰، (جنوری 1982ء)۔

117۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے ''تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ'' میں شاہ عبد اللہ العزیز کا ایک ملفوظ نقل کیا ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے چاروں صاحبزادوں کے دستارِ فضیلت باندھ دی تھی، ص۳۱۰، (حیدرآباد، دکن: 1946ء) مگر یہ خیال صحیح نہیں، ملفوظ کی عبارت اس کی تردید کر رہی ہے، تذکرہ شاہ ولی اللہ میں اس ملفوظ کی ابتدائی کلمات: ''ہم چنانکہ بعد انتقال تم'' ترک ہوگئے ہیں، جس کی وجہ سے یہ غلط فہمی ہوئی۔

118۔ بیاض حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (م۱۲۴۵ھ/ 1829ء) ورق ۵۳ب، (ذخیرہ ذاتی)۔

119۔ بیاض مولانا شیخ محمد تھانوی، قلمی نسخہ مؤلف، مملوکہ جناب ثناء الحق صدیقی، کراچی، راقم سطور اس بیاض سے استفادہ اور اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کے لیے محترم صدیقی صاحب کا بے حد ممنون ہے۔

120۔ یادداشت ملحق ومجلد مع مجموعہ تحریرات وفتاویٰ، ص۴۷۔

121. تاریخ الائمہ، ص۷۴۷.

122۔ ابوالعلائی داناپوری، سیر دہلی، ص۳۷۔

123۔ دہلی اور اس کے اطراف، ص۳۵، نزہۃ الخواطر میں شاہ عبد الغنی کا تذکرہ شامل نہیں۔

124۔ یادگارِ دہلی، ص۱۰۴، مولوی بشیر الدین احمد نے ولی اللہی کے یہی الفاظ واقعات دار الحکومت میں نقل کر دیئے ہیں، ص۵۹۰، ج۲۔

124(ب) مثلاً: مزاراتِ اولیائے دہلی، مولوی محمد عالم شاہ فریدی، ص۱۴، (دہلی ۱۳۴۶ھ)، تاریخ اولیائے صوبہ دہلی، ص۲۰۱ (دہلی: ۱۳۵۴ھ) التمهيد بتعريف ائمة التجديد، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، ص۱۰۰، (جام شورو، سندھ: ۱۳۹۶ھ)، تراجم علمائے اہل حدیث ہند، ص۷٦، تاریخ دعوت وعزیمت، از ابوالحسن علی ندوی، ص۳۴۵، ج۵۔

125۔ سید احمد ولی اللہی، یادگارِ دہلی، ص۱۰۴۔

126. تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص۷۴۷.

127۔ مولوی رحیم بخش نے لکھا ہے کہ: ''مولانا شہید کی تاریخ ولادت میں علماء کا باہم اختلاف ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ آپ ۱۲ر ربیع الثانی سنہ ۱۱۹۳ھ کو پیدا ہوئے''، (ص۳۵۳، حیاتِ ولی) مگر راقم سطور کو ایسی کوئی شہادت میسر نہیں ہوئی، جس میں کسی مؤرخ و تذکرہ نگار نے سنہ ۱۱۹۳ھ کے قول سے کسی معقول بنا پر اختلاف کیا ہو، میر شجاعت علی کے حوالہ سے شوال سنہ ۱۱۹٦ھ کی ایک روایت مہر صاحب نے نقل کی ہے، مگر اس کو مہر صاحب نے خود لکھ دیا ہے: ''شایانِ توجہ نہیں''، جماعت مجاہدین، ص۱۱۷، (غلام علی اینڈ سنز، لاہور: بلا سنہ)۔

128۔ تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ، ص۷۴۷، لیکن حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولانا کرامت علی جونپوری کے حوالہ سے

www.rahimia.org

واقعہ بیعت کی جو تفصیل لکھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شہید، سید صاحب کی ٹونک سے واپسی کے بعد ان سے بیعت ہوئے تھے، سیرتِ سید احمد شہید، ص۱۴۵، ج۱۔

129۔ احوال وکمالاتِ عزیزی، ص۴۱۔

130۔ حیاتِ ولی، ص۳۵۲۔

131۔ تاریخ اہل حدیث، ص۴۱۹، (دہلی 1983ء)۔

132۔ غلام رسول مہر، جماعت مجاہدین، ص۱۱۷۔

133۔ نسیم احمد فریدی، تذکرہ شاہ محمد اسماعیل شہید، ص۱۴، ص (لکھنؤ: 1977ء)۔

www.rahimia.org

## اعلانِ تصحیح

قارئین نوٹ فرمالیں کہ سہ ماہی ''شعور وآگہی'' کا گزشتہ شمارہ جولائی تا ستمبر 2009ء/ رجب تا رمضان 1430ھ جلد نمبر 1 کا شمارہ نمبر 1 اور 2 تھا۔

آراء و تأثرات

# گرامی نامے

گزشتہ شمارے سے مجلّہ ''شعور وآگہی'' کا آغاز کیا گیا تھا۔ اور ملک بھر میں علماء، دانشور اور پروفیسر حضرات اورنوجوان احباب تک اس مجلّے کی رسائی ہوئی، دوستوں نے خوب پذیرائی بخشی اور اپنے آراء اور تأثرات سے ہمیں آگاہ کیا۔ اور بہت سے دوستوں نے مفید مشورے بھی دیئے، ہم ان تمام حضرات کے شکر گزار ہیں، ان میں سے چند احباب کی آراء اور تأثرات پر مبنی خطوط ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں، ان تمام احباب کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں، جنھوں نے اس سلسلے میں اپنے تأثرات و آراء پر مبنی خطوط ہمیں ارسال کیے۔ (مدیر اعلیٰ)

## (1)

محترم جناب مفتی عبدالخالق آزاد صاحب زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی قدر۔ اُمید ہے کہ حضرت اقدس مدظلہ العالی بھی بخیرو عافیت ہوں گے اور رمضان المبارک کی بہاروں سے مستفید ہو رہے ہوں گے۔ سہ ماہی مجلّہ ''شعور وآگہی'' مل گیا۔ آپ نے حضرت اقدس کی سرپرستی میں یہ رسالہ نکال کر بہت بڑے کام کی ابتداء کی ہے۔ خانقاہِ رحیمیہ رائے پور کی دینی و انقلابی سرگرمیوں سے کون واقف نہیں، سب جانتے ہیں۔ آج اس دور میں جب کہ مسلمانوں پر طرح طرح سے کفر و باطل کی یلغار ہے، اب اس کا رخ پاکستان کی طرف زیادہ ہی ہوگیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر محاذ پر اس کا دفاع کیا جائے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنی نوجوان نسل کی صحیح خطوط پر دینی، سماجی، معاشی، معاشرتی آگہی کی طرف رہنمائی کریں اور وہ پختہ شعور پیدا کریں جو قرنِ اوّل کے مسلمانوں کا تھا۔ حضرت مدظلہ عرصے اس کے کوشاں رہے ہیں، انھوں نے اس سلسلے میں بادِ مخالف کے شدید جھونکوں کی کبھی پرواہ نہیں کی اور الحمد للہ ایک حلقہ ایسا پیدا کرلیا ہے جو اس ضرورت کو سمجھتا ہے اور ان کی دعوت پر لبیک کہتا ہے۔ اب آپ نے یہ مجلّہ نکال کر علمی طور پر اقدام کیا ہے۔ بڑا مستحسن قدم ہے اللہ مبارک کرے۔

رسالہ ماشاء اللہ خوب ہے۔ ظاہری و باطنی دونوں محاسن سے آراستہ ہے۔ رسالے کو جو چار عنوانات میں تقسیم کیا ہے وہ وقت کے لحاظ سے بہت اہم ہیں، دینی شعور اور سماجی آگہی کا جو عزم آپ لے کر چلے ہیں اس میں یہ بہت ممد و معاون ثابت ہوں گے، بلکہ یوں کہیے آپ نے صحیح سمت قدم اٹھایا ہے، پھر عنوانات کے تحت جو مضامین و مقالات شامل کیے ہیں وہ شاہ ولی اللہ کی انقلابی تحریک کے عین مطابق ہیں۔

www.rahimia.org

''مطالعہ قرآن'' کے عنوان سے امامِ انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے افادات پر مشتمل ''تفسیر سورۃ التغابن'' مرتبہ حضرت مولانا بشیر احمد لدھیانویؒ پہلی مرتبہ اس مجلّے کے ذریعے منظر عام پر آئی ہے یہ بہت بڑی علمی خدمت ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کی فکر کو جھنجوڑنے کے لیے بہت مؤثر ہے۔ یقین ہے کہ اس سے رسالے کے مقاصد کی تکمیل میں مدد ملے گی۔

''مطالعہ سیرت نبویؐ'' کے ذیل میں ''سماجی تشکیل نو کا تصور اور لائحہ عمل، اسوۂ حسنہ کے تناظر میں'' پروفیسر ڈاکٹر سعیدالرحمٰن صاحب کا مقالہ بڑا فکر انگیز ہے۔ سماجی تشکیل نو اور اجتماعی تبدیلی کے لیے جن بنیادی نکات کو اٹھایا ہے وہ نفس مضمون کی تفہیم کے لیے ضروری تھے، پھر قرآن و سنت اور آثارِ صحابہ سے اس کی توضیح و تشریح کر کے بھرپور اور مکمل لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ اس مضمون کی اساس بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تعلیمات پر رکھی ہے، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ''قرآنی شعورِ انقلاب'' سے بہت سلیقے سے استفادہ کیا ہے۔

''مطالعہ سیرت صحابہؓ'' کے تحت تیسرا مقالہ ''اسلام کے عہد اول میں خواتین کا کردار''، مولانا محمد ناصر صاحب نے بڑی کاوش و محنت سے لکھا ہے۔ عورت کے مقام کا تعین، اسلام میں عورت کی عظمت، اس کی ذمہ داریاں، اس کی سرگرمیاں، اس کی خدمات کا بیان کرنے کے ساتھ ہی ساتھ عورت کے متعلق مغربی فکر کا بھی جائزہ لیا ہے، اس طرح اسلام اور کفر کا ایک جہت میں موازنہ بھی ہوگیا ہے۔ یہ مقالہ بھی فکر کے منجمد سوتوں کو کھولنے میں مدد ہے۔

''تعارفِ شخصیات'' کے ذیل میں حضرت مولانا بشیر احمد لدھیانویؒ کا انتخاب بھی خوب ہے۔ آپ نے بلاشبہ تاریخ انقلاب اور فکر ولی اللہی سے وابستہ ایک معزز شخصیت کے حالات پیش کر کے اپنے مقصد کو بہت عمدہ طریقے سے واضح کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شخصیت کی شعوری کوششیں اور اخلاص و دل سوزی کے ساتھ کی گئی جدوجہد ذہنوں میں دائمی نقوش چھوڑتی ہے۔

بحیثیت مجموعی رسالے کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انقلاب آفریں خیالات سے مزین ہے، اسلامی انقلابی فکر بیدار کرنے کے لیے کوشاں ہے اور معاشی و معاشرتی، اخلاقی و تہذیبی اصلاح و ترقی کا خواہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے اور حضرت اقدس شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی کی سعی و کوشش کو قبول فرمائے جو وہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان نسل میں دینی غیرت وحمیت اور انقلابی فکر و آگہی کی تربیت کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس تمام کوشش و کاوش کے بہتر نتائج برآمد فرمائے۔ آمین۔

ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ میرا نام آپ نے جو دیا ہے اس کی تصحیح فرمادیں۔ پورا نام محمد عبدالمقیت شاکر علیمی ہے۔ سب احباب کو سلام، حضرت اقدس کی خدمت میں مؤدبانہ سلام اور دعا کی درخواست۔ اہلیہ بھی سلام عرض کرتی ہیں اور دعا کی درخواست بھی۔

والسلام

احقر محمد عبدالمقیت، کراچی

مؤرخہ ۹ ستمبر ۲۰۰۹ء

www.rahimia.org

## (2)

محترمی ومکرمی جناب مولانا مفتی عبدالخالق آزاد صاحب

مدیر اعلیٰ سہ ماہی مجلّہ ''شعور وآگہی''، لاہور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ادارہ رحیمیہ کی طرف سے طبع شدہ تحقیقی مجلّہ شمارہ نمبر 1 جلد نمبر 1، ماہِ جولائی تا ستمبر 2009ء، رجب تا رمضان ۱۴۳۰ھ کا مطالعہ کیا ہے۔ ماشاء اللہ کسی بھی تحقیقی مجلّہ کی جو خوبیاں ہوتی ہیں، وہ جملہ اس میں موجود ہیں۔

اس وقت ملکی سطح پر مختلف ادارے تحقیقی مجلّات شائع کر رہے ہیں، جن میں علمی احباب کام کر رہے ہیں اور ان مجلّات میں موضوعات کو عقلی ونقلی دلائل سے مزین کر کے پیش کر رہے ہیں۔ لیکن مجلّہ ''شعور وآگہی'' کی منفرد اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محض علمی بحثیں نہیں کی گئیں بلکہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے جس سماجی نظام کی ضرورت ہے اس کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

جن موضوعات وشخصیات کو پیش کیا گیا ہے، یقیناً قابل تحسین ہیں، عمومی طور پر جو افراد علمی موضوعات پر بات چیت کرتے ہیں وہ خود مایوسی کا شکار ہیں اور عوام میں بھی مایوسی پھیلانے کا ذریعہ ہیں۔ مجلّہ ''شعور وآگہی'' میں ایک فرد کے انفرادی واجتماعی تقاضوں کو سمجھانے کے ساتھ ساتھ سماجی ڈھانچہ کی تشکیل میں اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں، اس پر بھی بات چیت ہوئی ہے۔

یہ بات محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ اس مجلّہ میں اس صراطِ مستقیم کی نشاندہی کی گئی ہے جس کا آغاز انبیاء علیہم السلام سے ہو کر ولی اللہی سچی جماعت تک پہنچتا ہے اور اس جماعت کا تسلسل آج خانقاہِ رائے پور کی وساطت سے ملکی وبین الاقوامی سطح پر جہد مسلسل کے طور پر جاری ہے۔

اس مجلّہ کو زیادہ سے زیادہ علمی حلقوں تک پہنچنا چاہیے تا کہ اعلیٰ شعور ونظریہ سے مزین ہو کر دور کے جدید تقاضوں کے مطابق حکمت عملی تشکیل دی جا سکے۔ اللہ رب العزت ان تمام احباب کی حفاظت فرمائے جنہوں نے اس مجلّہ کے لیے کاوش کی ہے، سرپرست اعلیٰ حضرت اقدس شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی جو اسلاف کی نشانی اور جانشین ہیں، ان کی سرپرستی تادیر ہم پر قائم رکھے۔ آمین والسلام

احقر حافظ محمد اختر

13/B گلزار کالونی، گوجرانوالہ

www.rahimia.org

## (3)

محترمی ومکرمی جناب مولانا مفتی عبدالخالق آزاد صاحب
مدیر اعلیٰ سہ ماہی مجلّہ ''شعور وآگہی''، لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے!

احوال تحریر یہ ہے کہ مجلّہ ''شعور وآگہی'' پہلی دونشستوں میں پڑھا۔ اچھی کاوش ہے۔ اور یقیناً اہل علم کے ہاں اس کو اچھی پذیرائی ملے گی۔ اسے پڑھنے کے بعد فوراً جو محسوسات ہوئے۔ وہ آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں:

1۔ انتہائی تحقیقی اور بہترین مواد ہے۔

2۔ تمام مضامین نئے تھے۔ یہ وجہ بھی خاصی دلچسپی کا باعث بنی۔ (آئندہ بھی یہ روایت قائم رہے تو بہتر ہے)

3۔ مضامین تھوڑے طویل تھے۔ اگر ایک یا دو مضامین (مقالہ جات) قدرے مختصر ہوں، بہتر رہے گا۔

4۔ سرورق کے کلر (Colour) کو مزید بہتر کیا جائے۔

5۔ قیمت تھوڑی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ دوست اس کو Gift دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کریں گے۔ کیوں کہ ایک/ دو مجلّے تو تحفتاً دینے کے بعد ہی کوئی خریدار/ ممبر بنے گا۔

بہر الحال اس کی اشاعت مسلسل رہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب دوستوں کی محنت کو ثمر آور فرمائے۔ آمین

تمام دوستوں خصوصاً حضرت جی مدظلہ العالی کو بہت بہت سلام۔

آپ کی دعاؤں کا طالب

اطہر سعید، کراچی

21 اگست 2009ء

www.rahimia.org

# حضرت الامام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ: ملتِ اسلامیہ کا مہر منیر

''شاہ عبدالعزیز کے حلقہ تعلیم و تربیت سے بے شمار ایسے بلند قامت انسان اُٹھے کہ ان کا طرہ فضل و کمال غزالی و رازی سے آنکھیں ملاتا تھا، اور جن کی مجالس درس اپنی وسعت اور اثر و نفوذ میں علمائے متقدمین کی یاد تازہ کراتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک فضل و کمال کا منبع اور علم و ارشاد کا سرچشمہ تھا، ان کا وجود ہندی ملت اسلامیہ کے لیے سرمایہ فخر و مباہات اور وجہِ نازش و افتخار تھا، پچھلے دو سو برس کی تاریخ میں اور آج بھی برصغیر ہند، پاکستان اور بنگلہ دیش کا کون مسلمان ہے جو ایمان و عقائد کی اصلاح اور طریقہ ہدایت و سنت کی دریافت اور پیروی میں ان بزرگوں کے خوانِ علم کا خوشہ چین اور ممنون کرم نہیں، اور اس برصغیر کے کس ادارہ اور تحریک کے اصلاحی، تعلیمی نظریات کا رشتہ شاہ عبدالعزیز یا ان کے حلقہ تلامذہ سے وابستہ نہیں، بلاشبہ اس براعظم کی گزشتہ دو سو برس کی دینی، علمی، اصلاحی، تصنیفی اور فکری تاریخ شاہ عبدالعزیز کی خدمات و اثرات کی تاریخ ہے، اور ہندی ملت اسلامیہ کا ہر ادارہ، تعلیم و تبلیغ کا ہر مرکز، اور ارشاد و تلقین کا ہر اک حلقہ، چاہے اس کو اس وقت کچھ بھی رنگ اور نام دے دیا گیا ہو وہ فیضانِ عزیزی کا ایک ثمر ہے۔

شاہ عبدالعزیز ہندوستان کی ملت اسلامیہ کا وہ مہر منیر، وہ نیر تاباں اور وہ گوہر شب تاب ہے، جس کے دم قدم سے ہندوستان میں اسلام کا ٹمٹماتا چراغ روشن، توحید کا غلغلہ بلند اور اتباعِ سنت کا ولولہ تازہ ہوا، ان کی کاوشوں کا عکس آج بھی دل فروز اور ملت کے لیے مینارۂ نور ہے اور بے شک و شبہ کہا جاسکتا ہے کہ اس برصغیر کے بیشتر تعلیمی و تبلیغی سلسلے انھیں کے سوزِ دروں کی بازگشت اور انہیں کی کاوشوں کا پرتو ہیں، جس کے اثرات سے ہندو پاکستان اور بنگلہ دیش کا خطہ خطہ منور اور ذرہ ذرہ درخشاں ہے:

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند''

(حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اجدادِ گرامی اور اخلافِ کرام)

www.rahmia.org

Quarterly Lahore
Shauor o Aaghi
R.No. S - 370

فکروشعور کو اجاگر کرنے والی کتابیں

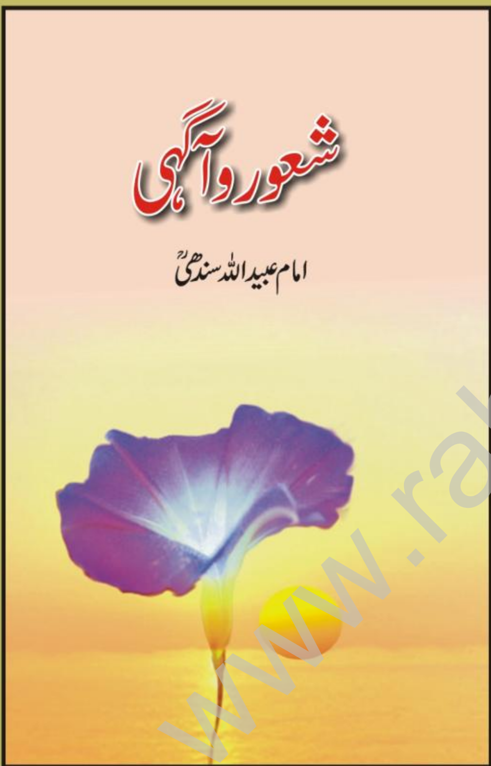

www.rahimia.org

رحیمیہ مطبوعات
رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ، شاہراہِ فاطمہ جناح، لاہور